Regd. No. L

دسمبر ۱۹۳۶ء

ادب لطیف لاہور

ادبِ لطیف
لاہور

ایڈیٹر: برکت علی چوہدری

نمبر شمار ۳ | دسمبر ۱۹۴۶ء | جلد ۲۴

مضامین

منظومات

افسانے اور ڈرامے

نامی پریس میلہ اخبار سٹریٹ لاہور میں باہتمام برکت علی چوہدری پرنٹر و پبلشر

سخنہائے گفتنی

پچھلے شمارے میں ہم نے ادبِ لطیف کے انتظامی معاملات میں چند اہم تبدیلیاں رونما ہو جانے کے بارے میں ضمنی طور پر کچھ گذارشات کی تھیں۔ ہر چند ہم چاہتے ہیں کہ ان تلخ حقائق کے اعادہ سے اپنے کرمفرماؤں کو پریشان نہ کیا جائے لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جن کی طرف مزید اشارے کئے بغیر ادبِ لطیف میں لکھنے اور اسے پڑھنے والوں میں غلط فہمی کا پیدا ہو جانا ضروری ہے صرف یہی نہیں بعض مخالف طاقتوں کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم اُنکی جائز روک تھام کیلئے حقیقت سے گریز نہ کریں۔

ادبِ لطیف میں چھپنے کے لئے سینکڑوں مضامین نظم و نثر ہر ڈاک سے موصول ہوتے ہیں۔ اُن میں نوجوان قلم کاروں سے لیکر ملک کے چوٹی کے فن کاروں کی چیزیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسالے کی محدود ضخامت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کتنے ہی مضامین اس کی اگلی اشاعتوں کے لئے رکھ لئے جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض نہایت اچھی چیزوں کے چھپنے کی باری مہینوں تک نہیں آتی۔ گذشتہ چھ سات ماہ بلکہ اِس سے بھی زیادہ مدت میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ادبِ لطیف کے پہلے کارکن بے شمار نظم و نثر کے مضامین فراہم کرتے رہے۔ تا آنکہ وہ اِس سے الگ ہو گئے اور اِس طرح جمع کیا ہوا۔ تمام "اندوختہ" یا تو اپنے ساتھ لے گئے۔ یا پھر ہمارے لئے چند ایسی چیزیں چھوڑ گئے۔ جن کی اشاعت پرچہ کے معیار اور اس کے رجحانات کے پیشِ نظر ممکن نہیں۔ اِس لئے ہم اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اب ہمارے پاس اُن کی ایسی کوئی قابلِ اشاعت چیز نہیں جو اُنہوں نے اکتوبر ۱۹۴۶ء سے پہلے ادبِ لطیف کو چھپنے کی غرض سے ارسال کی ہو۔ اِس لئے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی پُرانی بھیجی ہوئی چیزیں کسی نئے پرچے میں چھپنے کی بجائے صرف ادبِ لطیف ہی میں شائع ہوں تو وہ اُن کی ایک نقل ہمیں دوبارہ بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ تاکہ ہمیں اُن پر غور کرنے کا موقع مل سکے۔

اگست، ستمبر اور اکتوبر کا ادبِ لطیف شائع نہیں ہو سکا۔ دراصل یہی تین مہینے تھے جن میں ہمارے انتظامی معاملات نہایت درجہ درہم برہم رہے۔ چنانچہ اِن تین مہینوں میں جن حضرات نے ادبِ لطیف کے وی پی وصول کئے یا اُس کا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجا ہمیں اُن کا صحیح ریکارڈ نہیں مل سکا اِس لئے اِن حضرات کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اپنا وی پی کا کوپن یا منی آرڈر کی رسید ہمیں فوراً ارسال فرمائیں تاکہ اُن کا نام خریداروں کی فہرست میں درج ہو سکے اور اُنہیں ادبِ لطیف کسی دقت کے بغیر ملنا شروع ہو جائے۔

ادبِ لطیف نے اردو ادب کا جو نیا معیار قائم کیا اور اسے جس خوبی سے نہ صرف برقرار رکھا۔ بلکہ مستقبل میں اسے بلند سے بلند تر کرنے کا جو بیڑہ اس نے اٹھایا ہے وہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہے لیکن ایک بات جو ہمیں ہمیشہ سے کھٹکتی رہی اور جس سے ہمارے قارئین ہمیشہ پریشان رہے۔ وہ رسالے کی اشاعت میں بڑھتی ہوئی بے قاعدگی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے پہلے کارکنوں کو اشاعت میں بے قاعدگی سے کوئی خاص لگاؤ تھا بہرحال ہماری آئندہ یہ کوشش رہے گی کہ ہم اس پرانی رسم کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیں۔ اور پرچہ ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں پڑھنے والوں کی خدمت میں پہنچا دیا کریں۔

اور ایک بات اور ———— یعنی جواب طلب اُمور کیلئے دو پیسے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

اور خریداروں کو چاہئے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ جواب میں تاخیر کا احتمال ہے۔

برکت علی چوہدری

سید عابد علی عابد

ناٹک

اس بات کو پھیلا کر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ (سٹیج) ناٹک وہ کہانی ہے جو اس مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی جائے کہ اسے ایکٹروں کی مدد سے سٹیج پر کھیلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑوں سیانوں نے ناٹک کے لئے تین چیزیں ضروری قرار دی ہیں۔ ایک سٹیج دوسری کھیل دکھانے والے اداکار تیسری کھیل دیکھنے والے۔ یعنی سامعین اور ناظرین کیونکہ ناٹک دیکھا بھی جاتا ہے۔ اور سنا بھی جاتا ہے۔
اب یہ کہنے کی ضرورت شاید باقی نہیں رہی۔ کہ ناٹک کے مصنف سٹیج اداکاروں اور دیکھنے والوں سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اور انہیں متاثر بھی کرتے ہیں۔ یہی ایک بات کہ ناٹک کی ہر چیز کو سٹیج پر دکھایا جانا مقصود ہے۔ قدم قدم پر، مصنف کو روکے گی اور اسے سوچنے پر مجبور کرے گی۔ کہ کہیں کوئی ایسا پیچیدہ الجھا ہوا سین نہ لکھ دے جس کا سٹیج پر دکھانا ناممکن ہو۔ سٹیج کا طول و عرض اسے اس بات پر مجبور کرے گا۔ کہ وہ اپنے کیریکٹروں کی آمد و رفت کو استادانہ طریقے سے استعمال کرے۔ اور اس بات کو کبھی فراموش نہ کرے کہ بہت سے کریکٹروں کا سٹیج پر جمع ہو جانا ناممکن تو نہیں، لیکن ان کا سنبھالنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ سٹیج پر کیریکٹر یا اداکار ہر وقت گویا ہو یا خاموش، دائیں ہو یا بائیں لگاتار ایکٹ کرتا رہتا ہے۔ اور جب بہت سے کریکٹر سٹیج پر جمع ہوتے ہیں تو اس طرح ایکٹ کرنا کہ توجہ کا مرکز وہ خاص کریکٹر ہی ہے۔ جس کے اردگرد سین یا منظر گھوم رہا ہے۔ بہت مشکل ہے۔ انہیں باتوں اور مشکلات کو مدنظر رکھ کر یہ بنیادی قانون بنایا گیا۔ کہ تمام غیر ضروری کیریکٹروں سے ناٹک کو پاک ہونا چاہئے۔ جو کریکٹر سٹیج پر آئیں۔ ان کی حالت یہ ہو کہ ان کے بغیر گذارہ ہی نہ ہو سکے!
سٹیج کے طول و عرض اور ہال کی ترتیب و ساخت کے اعتبار سے بھی ناٹک کے پیش کرنے کا رنگ، متاثر ہوتا رہتا ہے۔ سٹیج ناٹک کی ایک خاص زبان ہے۔ ناول، افسانہ، سٹیج نہ ہونے والے ناٹک، دریاؤں کی طرح آہستہ آہستہ وقار سے بہتے ہیں۔ ان کے واقعات کی رفتار کا تیز ہونا بھی ضروری نہیں۔ زبان بھی عام طور پر معمولی کاروباری زبان کی ایک ادیبانہ یا صناعانہ جھلک ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف، ناٹک کو تین یا چار گھنٹے میں ختم ہونا ہے۔ اسی عرصے میں ڈرامے کے تمام مراحل کو طے کرنا ہے۔ آغاز، کشمکش کی ابتدا۔ کریکٹروں کے کردار کا انکشاف، حیرت آفریں انجام کی ابتدا اور آخر انجام بھی کچھ ان تین گھنٹوں میں ہونا ہے۔ پھر، جو لوگ سٹیج سے دور بیٹھے ہیں۔ ان تک بھی کھیل کا ہر لفظ پہنچانا۔ اور ان کو ایکٹر کی ہر حرکت کا پیغام سمجھانا ضروری ہے۔ انہیں پابندیوں کے باعث ڈراما نویس! مجبور ہو کر معمولی بول چال کی زبان کو ترک کر کے عموماً ایک مخصوص زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جو عام زبان سے زیادہ موثر، مبالغہ آمیز۔ صناعانہ۔ اور چنچل سی ہوتی ہے۔ بات کانٹے کی تول ہوتی ہے لیکن بڑے تکلف سے ہوتی ہے۔ بڑی نوک پلک نکالی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ناٹک میں کبھی کسی کا بھائی مر گیا ہے تو یوں نہیں کہا جائے گا۔ کہ مجھے سخت افسوس ہوا۔ کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ بلکہ وہاں باندھ کے ٹوٹ جانے سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور زندگی کی کمر دوتا ہو جاتی ہے۔ جونہی یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ ایکٹر کا ابتدائی اور سب سے زیادہ ضروری فرض یہ ہے۔ کہ اس کی آواز سب کو صاف سنائی دے۔ وہیں یہ نکتہ ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔ پہلے ڈرامے نظم میں کیوں لکھے جاتے تھے۔ اور ہندوستان کے ناٹکوں کی زبان مقفیٰ اور مسجع کیوں ہوتی ہے، یہ زبان معمولی زبان کی طرح فطری طریقۂ اظہار نہیں ہے۔ لیکن یہ دعوےٰ کس نے کیا ہے۔ کہ سٹیج پر ہر چیز فطرت کی نقل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے تمام بڑے بڑے نقاد ڈرامے کی [illegible] کہتے ہوئے کہ [illegible] سٹیج [illegible]

یا قانونِ فطرت کے مطابق ایکٹ کرنا اور بولنا ناممکن ہے، ایکٹر کا پہلا فرض ہے۔ کہ لوگوں تک اپنی آواز پہنچائے۔ اپنی ہر حرکت اور اپنے ہر انداز کا مطلب، الفاظ سے، اور اپنے الفاظ کا مفہوم انداز سے دیکھنے والوں کو سمجھائے۔ ایسا نہ کرے گا۔ تو ناٹک فارس ہو کر رہ جائے گا۔ اور دوسرے دن کوئی شخص یہ تماشا دیکھنے کیلئے نہ آئیگا۔ ظاہر ہے کہ سٹیج کی پابندیوں کو مدِ نظر رکھ کر بچارے ایکٹر کو اتالیق کا نعرہ بلند کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نعرے بلند کرنے ہوں تو مقفیٰ عبارت کی ترتیب سے اس کام میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ زبان غیر معمولی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ناٹک کا مطلب دیکھنے والوں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو، ہندی ناٹکوں میں، کریکٹروں کی گفتگو میں قافیوں کے بول برابر کھٹ کھٹ کرتے چلے آتے ہیں۔ اور مترادف فقروں اور لفظوں کے جوڑ توڑ سے، ایکٹر کو مدد پہنچاتے ہیں۔ "ترقیق کس حال میں ہے "شیر لڑنے کے جال میں ہے"۔ "اب بھی اگر میری بات سے انکار ہے تو یہ خنجر تیرے سینے کے پار ہے۔" بڑھنے سے ذرا طبیعت ضرور الجھی ہے۔ لیکن سٹیج پر انہیں فقروں کے لئے ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ کہ خاص طور پر پچھلی نشستوں والے لوگ تو محسوس بھی نہیں کرتے کہ ایکٹر بڑے جوش و خروش سے نعرے بلند کر رہا ہے۔ اور قافیہ طرازی کا دم بھر رہا ہے۔ جب تک ہماری سٹیج کی ساخت اور تربیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت تک غیر معمولی زبان اور قافیہ طرازی کی ضرورت باقی رہے گی۔ آغا حشر نے بڑی کامیابی سے یہ کھیل کھیلا ہے اور اپنی زبان کو ایسے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ کہ سننے والے تھوڑے سے عرصے میں زیادہ سے زیادہ متاثر ہو سکیں۔

جنرل:۔ خداوند وہ کیسا بھیانک کام ہوگا۔ جس کی ایسی ہولناک تمہید ہے۔

نادر:۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بات ناقابلِ شنید ہے۔

جنرل:۔ کسی سے دغا بازی کرنا!

نادر:۔ نہیں!

جنرل:۔ ملک میں فتنہ پردازی کرنا!

نادر:۔ نہیں۔

جنرل:۔ ڈاکہ!

نادر:۔ نہیں۔

جنرل:۔ جبر۔

نادر:۔ نہیں۔

آپ نے دیکھا۔ اس غیر معمولی زبان میں بھی قافیے کے کھٹکے لگے ہوئے ہیں۔ کہیں چھوٹے چھوٹے فقروں اور الفاظ کی حرکت سے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ ہے جس طرح بھی بن پڑے تھوڑے سے عرصے میں لوگوں کو کھیل کا مطلب سمجھانا اور ان کو متاثر کرنا مقصود ہے۔

ظاہر ہے کہ مصنف کی تمام جادوگری کے باوجود اگر ایکٹروں کا انتخاب اچھا نہیں ہے۔ تو یہ قافیوں کے کھٹکے اور یہ سوال و جواب کی ترتیب اور یہ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے فقرے سب بیکار جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سٹیج ناٹک کے مصنف اس بات کا بھی ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی زبان ان کے فقروں کی ترتیب آواز کے اتار چڑھاؤ کی مترنم حرکات و سکنات کی نکتہ طرازی ایسی ہو کہ عام ایکٹروں کے ذہن نشین ہو جائے اور سٹیج پر اچھی طرح دیکھنے والوں تک پہنچائی جا سکے یہ نہ ہو کہ مصنف ایسے بلند معیار کا ناٹک لکھے کہ اس کے لئے ایکٹروں کا انتخاب ہی مشکل ہو جائے یا ایکٹروں کیلئے اس ناٹک کا مفہوم ہی ذہن نشین کرانا دشوار ہو جائے۔ مثلاً برنارڈ شا کے کھیل Pygmalin میں پروفیسر Higgens کے کردار کا نمایاں پہلو یہ ہے۔ کہ ہر کام تیزی سے کرتا ہے۔ چلتا پھرتا سوچتا۔ بولتا تیز ہے۔ گویا بجلی ہے کہ ادھر سے ادھر لہرا رہی ہے۔ سٹیج پر اس کے کردار کا انکشاف نہایت مشکل ہے۔

تیز بولنا ضروری اور اس طرح بولنا بھی لازمی۔ کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف صاف سنائی دے اور بھی ضروری خاص طور پر تیسرے ایکٹ کے اختتام پر، جہاں پروفیسر ہگنز

اور کرنل پکرنگ دونوں ایک ساتھ مل کر باتیں کرتے ہیں، اس سین کو سنبھالنا بہت دشوار ہے۔ اور وہی اثر پیدا کرنے کے لئے جو مصنف کے ذہن میں تھا۔ بڑی چابکدستی اور مہارت درکار ہے۔

جذبات کی شدت یا لطافت کے اظہار کے لئے، عموماً آج سے کچھ سال پہلے تک ہندوستان کے ناٹکوں میں قافیہ طرازی کے علاوہ اشعار بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان اشعار کی اثرانگیزی اور برمحل ہونے کے متعلق ہمارے نقادوں کی رائے مختلف ہے۔ کچھ بزرگوار تو یہ فرماتے ہیں۔ کہ شعر سرے سے ناٹک میں ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ذہن انسانی، لطیف اور نفیس جذبات کے اظہار کے لئے طبعاً، شعر کا یا شاعرانہ انداز بیان کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ اور اصول کے طور پر اس سہارے سے اسے محروم کر دینا بڑا ظلم ہے۔ ہاں بے ضرورت، موقع بے موقع اشعار کے استعمال سے ضرور دل الجھتا ہے۔ لیکن حشر کے ڈراموں میں اشعار عام طور پر ایسے باموقع استعمال ہوتے ہیں اور شعر خود ایسے اچھے ہوتے ہیں۔ کہ سین کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کی غزل اس معرکے کی ہوتی ہے۔ کہ بعض اوقات اس کے برمحل اور بےمحل ہونے کی طرف ذہن متوجہ ہی نہیں ہوتا ؎

چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی ۔ خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

حبیب اتنی بے وفائی پر اسے دل پیار کرتا ہے۔

الٰہی پھر وہ ظالم باوفا ہوتا تو کیا ہوتا!

ایسے شعر سن کر یہ سوچنے کی تکلیف کون کرے گا کہ غزل یا گیت یا اشعار کے استعمال کا یہ موقع برجستہ، مناسب اور صحیح تھا یا نہ تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ ناٹک میں کیریکٹروں کے کردار کا انکشاف مکالمے، اور حرکات و سکنات کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے نقاد اور سیانے اب یہ کہتے بھی سنے جاتے ہیں۔ کہ کھیل کا جو مطلب حاضرین کے ذہن نشین کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کی تشریح میں سینری، روشنی اور نور و ظلمت کی جادوگری، لباس، موسیقی، اور سیٹنگ کی ترتیب و تشکیل بھی بہت معاون ہوتی ہے، یعنی یہ تمام چیزیں مل کر، واقفیت کی فضا پیدا کرتی ہیں اور دیکھنے والے اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ واقعی ان کے سامنے زندگی کی ایک تصویر پیش کی جا رہی ہے۔ یعنی اُنہیں نقل پر اصل کا شبہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل کے ناٹکوں کے متعلق یہ دعوے سچ ہو جائے۔ لیکن ماضی کے اور حال کے ناٹک لکھنے والوں کی اکثریت ان چیزوں سے، کم و بیش بے نیاز تھی اور ہے، سفوکلیز، شکسپیئر، شیریڈن، شا، گالزوردی، بیری، بیتاب، احسن، حشر، ان۔ سب کے سامنے، سٹیج کا یہ معیار نہ تھا۔ نہ ان کی نظر میں سٹیج کے ان لوازم کو یہ اہمیت حاصل تھی نہ ان لوازم کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اپنے ناٹک لکھے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انگلستان میں، شکسپیئر کے بعض کھیل، بڑے تکلف اور اہتمام سے کھیلے گئے ہیں۔ اور سٹیج کی آرائش اور نوک پلک کا بہت خیال رکھا گیا ہے پھر بھی، ان باتوں کے ذریعے، نہ تو کردار کی فطرت کے انکشاف میں کوئی مدد ملی نہ ان سے مطلب کے ذہن نشین ہو جانے کے سلسلے میں نئے راستے کھلے، بلکہ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کی توجہ، اس آرائش، اہتمام، تکلف، اور بناوٹ کی طرف ایسی بٹ گئی۔ کہ اصل یعنی شکسپیئر کا ڈرامہ، ایک ضمنی سی بات ہو کر رہ گیا۔ یعنی بات کی شان بڑھ گئی اور دولہا میاں ٹاپتے رہ گئے۔ بے تاب، حشر اور احسن کے کھیل بھی ان تکلفات کے محتاج نہیں ہیں۔ فریب کاری، اور نقل کو اصل بنا دینا درحقیقت ایکٹر کے کمال فن کا کرشمہ ہے اور ہندوستان کے اچھے ناٹک لکھنے والے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ ایکٹر ہی اپنی حرکات و سکنات، انداز کے ذریعے، مکالمے اور گفتگو کی اہمیت اور معنی خیزی کے تمام پہلو روشن کر دے گا، یہی وجہ ہے کہ اگر سٹیج ناٹک کو گھر بیٹھ کر پڑھا جائے تو وہ لطف نہیں آتا جو انہیں سٹیج پر دیکھنے میں آتا ہے۔ بیری نے اپنے ڈراموں کے مطبوعہ ایڈیشنوں میں ہدایات کی تفصیل اور پس منظر کے بیان سے وہی کیفیت پیدا کرنی چاہی ہے جو ایکٹر حرکات و سکنات اور انداز کلام سے سٹیج پر

پیدا کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی بات پوری طرح نہیں بنی۔ جو ناٹک البتہ سٹیج کے لئے نہیں لکھے جاتے ان میں اس قسم کی ہدایات اور تفصیلات سے، پڑھنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہی تفصیل ایسے ناٹکوں میں ایکٹر کی فنکاری کا بدل بن جاتی ہے۔

پچھلے دنوں سینما کو جو حیرت انگیز کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی بنا پر کہا جا رہا ہے۔ کہ ناٹکوں کا دور ختم ہوا۔ میرے خیال میں یہ بات غلط ہے۔ سٹیج پر جو ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھنے والوں اور ان کے دکھانے والوں یعنی ایکٹروں کے درمیان بے تکلفی کا سا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے ہر طرح ایکٹروں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ یہ بات سینما میں نہیں جس کے بُعد یعنی Dimentions ہی دو ہیں۔

یہ بات بھی ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ ناٹک، در اصل سٹیج ہی کی پیداوار اور سٹیج ہی کے سہارے سے زندہ ہیں۔ اور سٹیج کی کامیابی کا دارومدار دیکھنے والوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت پر منحصر ہے۔ اگر دیکھنے والے، ناٹک دیکھنے کے لئے تشریف ہی نہ لائیں تو ظاہر ہے کہ ناٹک کا خدا حافظ ہے۔ جوں جوں ہندوستان میں تعلیم عام ہوگی۔ اور ذہنی تربیت نئے سانچوں میں ڈھلے گی میرے خیال میں ناٹک کو فروغ ہوگا۔ سینما کا چراغ تو اب سٹیج کی پھونکوں سے بجھ نہیں سکتا۔ لیکن سینما کی آندھی بھی سٹیج ناٹک کے دیئے کو گل نہیں کر سکتی۔

(با اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ لاہور)۔

باری

ہندی آریہ فلسفہ

ہندی آریوں کے عقلی دور (۱۰۰۰ ق م سے ۳۰۰ ق م) میں کپل اور گوتم بودھ کی ہستیاں بہت نمایاں ہیں۔ ایک فلسفی تھا اور دوسرا مصلح۔ ایک نے فلسفے اور دوسرے نے اصلاح سے انسانوں کی خدمت کی۔ فلسفی صرف فلسفے تک ہی محدود رہا۔ اس نے صرف غور کرنے والوں سے مخاطب کیا۔ مصلح نے ایک نیا مذہب قائم کیا۔ کپل عمر بھر فلسفیانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ وہ گوتم بودھ سے سو سال پہلے پیدا ہوا۔ اس کے نام پر جو بستی آباد کی گئی گوتم بودھ اسی میں پیدا ہوا۔ کپل دنیا کا پہلا فلسفی ہے جس نے فلسفے کو تحریری صورت میں پیش کیا۔ اس نے عقلیت کی بنا پر بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں پر غور کیا۔ وہ اپنے فلسفے کو سانکھیا سوتر میں پیش کرتا ہے۔ اس کے فلسفے کا مقصد انسان کو ہر قسم کے دکھوں سے نجات دلانا ہے۔ وہ قربانی کی ویدک رسموں کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک انسان کی نجات گیان اور دھیان (علم و فکر) میں ہے۔ وہ اس تصور کو نہیں مانتا کہ تمام روحیں روحِ کل کے اجزا ہیں۔ اس کے نزدیک ہر روح کی ہستی الگ الگ ہے اور ہر روح نجات پانے کے بعد اپنی اسی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھے گی۔ اس کے نزدیک "روح کے سوا ہر چیز مادی ہے۔ نہ صرف عناصر، مدرکات اور اعضائے فعل مادی ہیں۔ بلکہ نفس، شعور اور ذہن بھی مادے ہی کے نتائج ہیں۔" وہ تین قسم کے ثبوت کا قائل ہے۔ 'ادراک'، 'استخراج'، اور 'تصدیق'، وہ کسی ایسی شے کا قائل نہیں جو ان ثبوتوں سے باہر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خالق کا قائل نہیں۔ وہ علیت کا قائل ہے۔ "ہر وجود کی علت ہے کیونکہ کوئی وجود علت کے بغیر نہیں ہو سکتا" وہ روح کے سوا باقی تمام اشیا کو مادی کہتا ہے اور تمام مادی اشیا کے سرچشمے کو "ابتدائی مادہ" (پراکرتی) کا نام دیتا ہے۔ وہ روح کے وجود کو مادے سے الگ تسلیم کرتا ہوا روحِ کل کا قائل نہیں بلکہ بہت سی روحوں کا قائل ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح میں پتانجلی نے کپل کے فلسفے میں خدا کے تصور کا اضافہ کر کے یوگ کا فلسفہ پیش کیا۔ کپل کے نزدیک روح صرف گیان اور دھیان ہی سے نجات پا سکتی ہے یعنی جسم کی آخری قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ پتانجلی نے اس نجات کے لئے جو ریاضت وضع کی اسے یوگ کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی طرف لو لگانے ہی سے روح کو جسم کی قید سے ہمیشہ کے لئے رہائی مل سکتی ہے۔ پتانجلی مشرقی ہندوستان کے ایک شہر گونارد کا رہنے والا تھا۔ اس کی زندگی کا بہت سا حصہ کشمیر میں کٹا۔

نیائے (منطق) کا بانی گوتم اپنے ہم نام گوتم بودھ کا ہمعصر تھا۔ کپل نے فلسفے کی بنیاد رکھی اور گوتم نے منطق کی۔ اس کی "نیائے سوتر" منطق کی پہلی کتاب ہے۔ پتانجلی کی طرح منطقی گوتم نے بھی کپل کے اس اصول کو مان لیا کہ "ہر شخص کی روح جدا جدا ہے۔ اور یہ روح جسم اور مدرکات سے الگ علم کا ایک مقام ہے ہر انفرادی روح لاتناہی اور ابدی ہے۔" لیکن گوتم نیائے سوتر میں کپل کے فلسفے میں اضافہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "روحِ عظیم ایک ہے۔ وہ ابدی علم کا مقام ہے یہی روحِ عظیم ہر چیز بنانے والی ہے۔" اس کے نزدیک ہر فعل نیکی یا بدی کی علت ہے وہ کہتا ہے کہ روح کی نجات کا انحصار فعل پر نہیں بلکہ علم پر ہے وہ نیائے میں صغریٰ اور کبریٰ (سلوجزم) کے ذریعہ استخراج کرتا ہے۔ اس کا سلوجزم پانچ اجزا سے مرکب ہے:۔

۱۔ پہاڑی کو آگ لگی ہوئی ہے۔
۲۔ کیونکہ وہاں سے دھواں نکلتا ہے۔
۳۔ جہاں کہیں سے بھی دھواں نکلے وہاں آگ ہوتی ہے۔

جیسے رسوئی۔

۴۔ پہاڑی پر سے دھواں نکل رہا ہے۔

۵۔ اس لئے وہاں آگ لگی ہوئی ہے۔

گوتم کے سلوجزم کے پہلے دو یا آخری دو اجزا اسٹا دیئے جائیں تو ارسطو کا سلوجزم بن جاتا ہے۔

کناد کا وشیشک ذریت پر مبنی ہے۔ ذریت سے مراد یہ ہے کہ ہر مادی چیز ذروں، پانی کو آبی ذروں، ہوا کو فضائی ذروں اور روشنی کو روشن ذروں سے مرکب بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک ذرات ابدی ہیں۔ اور ذروں سے مرکب اجسام مادی صرف منتشر ہونے کی صورت میں فنا ہوتے ہیں۔ آخری ذرہ مرکب نہیں بلکہ مفرد ہے۔ کناد کا وشیشک فلسفہ کم اور طبیعات زیادہ ہے۔ ہندوستان کے ان فلسفیوں نے مادے، حرکت، اجتماع اور انتشار کے قوانین وضع کئے۔ سارے ہندی آریہ فلسفے میں مادے کو ازلی اور روح سے الگ مانا گیا ہے۔ صرف ویدانت یہ تسلیم کرتا ہے کہ مادہ ایک ایسی روح عظیم کا مظہر ہے جو اپنے اندر سب کچھ رکھتی ہے۔

کپل کے فلسفے نے بہت سے مفکروں کو اپنشدوں کی تعلیم سے دور ہٹا دیا تھا۔ عوام بودھ مت میں شامل ہو کر ذات پات اور ویدک رسموں سے نکل چکے تھے۔ چنانچہ اس دور میں اپنشدوں کی عالمگیر روح کے مسئلے کو زندہ کرنے کے لئے فلسفے کے دو نئے اسکول جاری ہوئے۔ جنہیں میمانسا کہا جاتا ہے۔ جیمنی، پوروا میمانسا میں ویدک رسموں کے احیا پر زور دیتا ہے، ویاس، اتر میمانسا میں عالمگیر روح کی تعلیم دیتا ہے۔ اتر میمانسا کو ویدانت بھی کہا جاتا ہے۔ ساتویں صدی مسیحی کمارل بھٹ نے پوروا میمانسا کو پھر سے زندہ کیا اور نویں صدی میں شنکر اچاریہ نے ویدانت کے فلسفے کو غالب کر دیا۔ ویاس اتر میمانسا میں کپل کے سانکھ (سانکھیا)، پاتنجل کے یوگ اور کناد کے وشیشک کا رد پیش کرتا ہے۔ ویدانت کی رو سے "دنیا کا وجود، قرار، اور فنا خدا کے بس میں ہے۔ تخلیق اسی کے ارادے سے ہے۔ وہی دنیا کے بنانے کا مادی سبب ہے، وہ فاعل بھی ہے اور فعل بھی، وہ عظیم الشان ہستی تنہا ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں"

کنہیا لال کپور

دعوت میں بات کرنے کا سلیقہ

ہر دعوت میں عموماً دو طرح کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ وہ جو کھاتے کم ہیں اور باتیں بہت کرتے ہیں۔ اور وہ جو کھاتے بہت ہیں اور باتیں کم کرتے ہیں، یا بالکل نہیں کرتے۔ اول الذکر جماعت میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے بغیر شہر کی کوئی دعوت 'دعوت' کہی ہی نہیں جا سکتی۔ مثلاً رؤسا، وکلا اور تجار۔ اور موخر الذکر جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو مدعو کرنے والے کے دوست یا رشتے دار ہوتے ہیں۔ یا جنہیں زندگی میں ایک آدھ بار کسی دعوت میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ ان دونو جماعتوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ پہلی جماعت تقریباً ہر دعوت میں موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ دعوتوں میں شامل ہونا اس جماعت کا مستقل شغل ہے۔ اس جماعت کے افراد ایک خاص انداز سے بات کرتے ہیں۔ مثلاً دعوت کے شروع ہونے سے پہلے اس اخباری نمائندے کی ضرور مزاج پرسی کرتے ہیں۔ جسے ان برگزیدہ ہستیوں کی فہرست تیار کرنی ہوتی ہے جو دعوت میں شریک ہوئیں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے یہ اس نمائندے کے پاس چپکے سے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور صاحب سلامت کے بعد یوں گویا ہوتے ہیں

"کہیئے صاحب! کیا حال ہے، کبھی نظر ہی نہیں آتے۔ کبھی کوٹھی پر آئیے نا، بہت مصروف ہیں کیا؟ اچھا سنو، چیف ایڈیٹر کب بن رہے ہو۔ بھئی کل کی اشاعت میں تمہارا مضمون پڑھا بخدا لطف آ گیا۔ ایسی پختگی ہم نے کسی جرنلسٹ کی تحریر میں نہیں دیکھی۔ ظالم تم تو بات بات میں نکتے پیدا کیا کرتے ہو۔ اچھا بھئی یہ بتاؤ دیوان ہر بھجن داس کچھ تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ میرے نہایت عزیز دوستوں میں سے ہیں کہو تو ان سے تمہاری سفارش کروں۔ اچھا بھئی کبھی کبھی ملا کرو۔ آخر اتنی مصروفیت بھی کیا؟"

جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے ان کا نام اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا ہے۔ تو نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اور اگر موقع محل مناسب ہو تو بغلگیر ہونے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔

سر سے یہ بوجھ اتارنے کے بعد ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ صرف اپنی جماعت کے افراد سے بات چیت کرتے ہیں۔ اور دوسری جماعت کے لوگوں کی طرف یوں گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں "تم جیسے رینگنے والے کیڑوں کو اس دعوت میں آنے کا کیا حق ہے۔"

عموماً دعوت کے شروع ہونے سے پہلے ان لوگوں کا دل پسند موضوع سیاست یا تجارت ہوتا ہے۔ ایک دوست سے کہیں گے "میرے خیال میں تو نئے آئین کی بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہونا مشکل ہے۔ کم از کم مجھے جو اطلاعیں ملی ہیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔" دوسرے سے پوچھیں گے "سنایئے رائے بہادر صاحب، نئی کمپنی کی رسم افتتاح کب کر رہے ہیں بھئی آج کل تو کمال کر رہے ہو۔ ہر ہفتے ایک نئی کمپنی قائم کر دیتے ہو۔ اچھا تو کہیئے کیا امکانات ہیں اس نئی انڈسٹری کے۔ اگر آپ ڈائرکٹر ہیں تو ضرور حصے خرید دوں گا۔" تیسرے سے یوں ہم کلام ہوں گے "بڑا چار سو بیس ہے۔ لوگوں کو سبز باغ دکھا کر روپیہ لوٹنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ دیکھئے کہیں اس کی باتوں میں نہ آ جایئے گا۔"

کھانے کی میز کے سامنے بیٹھ کر ان کی گفتگو کا موضوع اکثر اپنی ذات یا "وہ بیماری" ہوتی ہے جس میں یہ مبتلا ہیں۔

"چائے پیجئے"

"نہیں صاحب شکریہ۔ ڈاکٹر ایکس (×) نے چائے بند کر رکھی ہے۔"

"تکلیف کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، ذیابیطس نے پھر آن دبایا ہے۔ آج کل انجکشن

لے رہا ہوں۔"

"یہ تو آپ کی پرانی شکایت ہے۔"

"جی ہاں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر زیڈ کے علاج سے کچھ افاقہ ہوا تھا۔ پھر تھوڑی سی بد پرہیزی کر لی۔ اور پرسوں سے تکلیف بڑھ گئی۔"

"آپ ہومیو پیتھک علاج کیجئے۔ دس برس ہوئے مجھے بھی یہی شکایت تھی۔ میں نے ڈاکٹر ایم (۴۸) سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ایک ہومیو پیتھک دوا تجویز کی۔ یقین مانیے ایک ہفتے میں بالکل تندرست ہو گیا۔"

"سچ۔"

"جی ہاں۔"

"آپ چاہیں، تو ابھی ان سے آپ کا تعارف کرا دوں۔ وہ بیٹھے ہیں اس کونے میں۔ وہ جو کنکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

"رس گلا کھائیے۔"

"نہیں صاحب، شکریہ! حکیم کل جھوشن نے ہر قسم کی مٹھائی سے پرہیز کرنے کو کہا ہے۔ آجکل ذرا ہاضمہ خراب ہے۔"

"سیر کو نہیں جانتے آپ؟"

"جی جانتا ہوں لیکن فٹن ہیں۔"

"تکلیف زیادہ ہے کیا؟"

"اجی کیا کہوں، کھانا کھانے کے بعد اس شدت سے درد کا دورہ پڑتا ہے، کہ چیختے چیختے بیحال ہو جاتا ہوں۔"

"حکیم وارث شاہ سے مشورہ کیجئے۔ پیٹ کی بیماریوں کے تو ماہر ہیں۔"

جب یہ لوگ بیماریوں کے متعلق باتیں کہتے کرتے تنگ آ جاتے ہیں تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ذاتی امارت یا شان و شوکت کے ذکر میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

"میرا خیال ہے، مسوری میں جو کوٹھی ہے وہ بیچ دوں۔ اور شملے میں دو کوٹھیاں بنا لوں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"نہیں آپ نے غلط سنا۔ میں انگلینڈ نہیں امریکہ جا رہا ہوں۔ امریکہ میں چائے کی تجارت کے کافی امکانات ہیں۔ چائے کے ساتھ ساتھ ایک تمباکو کی کمپنی قائم کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہوں۔ امریکہ میں ان دنوں صرف دو چیزوں کی کھپت ہے، چائے اور تمباکو۔"

"اب تو کہیں ہوائی جہاز سستے ہوں تو دو ایک خرید لوں۔ موٹروں سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ وار کو اٹی موٹریں بھی کوئی موٹریں ہیں۔ بیل گاڑیاں ہیں۔ ایک گیلن میں صرف دس میل، اُف! اور دوسرے ہفتے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔"

"جی ہاں! آج کل ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ اگلے مہینے لڑکی کی شادی ہے۔ بڑا خرچ اٹھ رہا ہے۔ دس ہزار کی تو صرف ساڑھیاں آئیں۔ پندرہ بیس ہزار موٹر کار کے لئے چاہئیں۔ اور زیورات، اُف! دیوالہ پٹ جائیگا۔ لیکن بھئی کیا کریں، اکلوتی لڑکی ہے۔ اور سمدھی ہیں دیوان کروڑی مل کے ہاں۔ جہیز میں پچاس ہزار نہ دونگا، تو ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔"

اب ذرا دوسری جماعت کی طرف آئیے۔ اس میں طرح طرح کے لوگ شامل ہیں۔ کچھ ایسے ہیں، جنہیں کسی دوست نے از راہِ خیرات دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ اور جو بھیگی بلی بنے ہوئے اس طرح بیٹھے ہیں۔ جیسے ابھی کوئی کان سے پکڑ کر انہیں دعوت سے نکال دیگا۔ کچھ وہ ہیں جو ہر بڑے آدمی کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ اور سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں سے بار بار پوچھ رہے ہیں۔ "کیوں صاحب . . . یہی ہیں نا۔ خاں بہادر آصف علی۔" "کیوں صاحب۔ وہ لمبی ڈاڑھی اور گھٹے گھٹے سر والے کون ہیں۔ کہیں یہی تو نہیں مولوی ابراہیم۔" "اچھا تو یہ پنڈت جمنا داس ہیں، میں سمجھا پنڈت گنگا دھر ہیں۔"

اس جماعت میں بیشتر لوگ گفتار کے نہیں کردار کے غازی ہوتے ہیں۔ ان کی تمامتر توجہ کھانے پینے کی چیزوں پر مرکوز ہوتی ہیں۔ آپ نے ان سے گفتگو کرنے کی کوشش کی، انہوں نے آپ کی بات سُنی ان سُنی کر کے آہستہ سے فرمایا۔ "سنبوسوں کی پلیٹ ذرا ادھر سرکا دیجئے۔" آپ نے پوچھا۔ "مزاج تو اچھے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "تکلیف معاف، اگر آپ رس گلے نہیں کھا رہے، تو ادھر دیدیجئے۔"

عموماً یہ لوگ آپس میں باتیں کرنے کی بجائے کھانا کھلانیوالے نوکروں سے کرتے ہیں۔

"چائے اور لانا۔" "بھئی، دیکھو دودھ پھر ختم ہو گیا۔" "بھئی ہم نے پکوڑے نہیں گلاب جامن منگائے تھے۔" "کیوں بھئی اس میز پر سروس

اتنی نکمی کیوں ہے۔ تین گھنٹے سے کیک کیک چلا رہے ہیں۔ کوئی سنتا ہی نہیں:

ان دو جماعتوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی جماعت صنفِ نازک کی ہوتی ہے۔ اس جماعت کی گفتگو کے موضوعات نہایت محدود ہوتے ہیں۔ مثلاً لباس، زیورات، سگائی، شادی۔

"بہت خوبصورت بارڈر ہے بہن۔ کہاں سے خریدا؟"

"یہ وہ بمبئی سے لائے تھے۔ ادھر پنجاب میں نہیں ہوتا۔ بالکل نیا سٹائل ہے۔"

"کیوں بہن آشا کی سگائی کر دی؟"

"ابھی کہاں! کوئی اچھا سا گھر ملے، تو کروں۔ تم ہی بتاؤ نا۔ برادری میں کوئی لڑکا۔"

"بہن آشا کی عمر بیس سال تو ہوگی۔"

"بیس کہاں۔ تمہاری لیلا سے چھ مہینے ہی تو بڑی ہے۔"

"بہن! ذرا سنبھل کر بیٹھ۔ تم نے تو میری ساڑھی کا ستیاناس کر دیا۔"

"اری، یہ آویزے تمہیں ذرا اچھے نہیں لگتے۔ لمبوترے چہرے کے لئے تو لمبے آویزے چاہئیں۔"

غرضیکہ دعوت میں بات کرنے کے یہ مختلف طریقے ہیں۔ لیکن ان میں سے سلیقہ کسی کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دعوت میں اگر آپ سلیقے سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ دعوت میں آئے ہیں، ہسپتال میں تشریف نہیں لائے۔ اس لئے اپنی بیماریوں کا ذکر مت کیجئے۔ نیز یہ مت بھولئے کہ دعوت میں اگر سامعین کسی شخص سے گھبراتے ہیں تو وہ باتونی آدمی ہے۔ اکثر دعوت میں دیکھا گیا ہے کہ ایک آدھ آدمی یہ تصور کر لیتا ہے کہ باتیں بنانا صرف وہی جانتا ہے۔ اور اگر وہ خاموش رہے گا تو ساری محفل پر مردنی چھا جائے گی۔ اس وہم میں مبتلا ہو کر وہ باتوں کا لاتناہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ ابھی مغل آرٹ پر بحث کر رہا ہے۔ تو دوسرے لمحے میں پیاز اور لہسن کے فوائد گنوا رہا ہے۔ گفتگو کا آغاز ہٹلر کے انجام سے کرتا ہے اور تان شباب کے آغاز پر توڑتا ہے۔ حتےٰ کہ سامعین ایک ایک کر کے اٹھنے لگتے ہیں۔ اور وہ خالی کرسیوں کو مخاطب کرتے ہوئے

کہتا ہے: "حضرات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں عجیب لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔"

باتونی آدمی میں یہ نقص ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کھانے کی میز کا ڈکٹیٹر Dictator سمجھتا ہے۔ کسی نے اسے ٹوکنے کی کوشش کی، اور اس نے منہ بنا کر کہا: "نہیں صاحب، یہ بات نہیں، دیکھئے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔" اور پھر جو واقعہ سنایا، تو یہ بالکل فراموش کر گئے۔ کہ جو بات وہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ ثابت بھی ہوئی یا نہیں۔ کسی نے ان پر فقرہ کسا تو ڈھٹائی سے کہنے لگے۔ "صاحب! دراصل آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ممکن ہے میں ہی مطلب واضح نہیں کر سکا۔ دیکھئے میرا مطلب یہ تھا کہ ......" اب جو آپ نے مطلب کی وضاحت کرنی شروع کی تو سارے معاملے کو یوں الجھا کر رکھ دیا کہ سننے والے سر پیٹ کر رہ گئے۔

باتونی شخص کی ضد وہ سنجیدہ آدمی ہے۔ جسے دعوت میں اس طرح چپ لگی رہتی ہے جیسے وہ دعوت میں شریک ہونے کے لئے نہیں آیا بلکہ خاموش رہنے کی مشق کرنے آیا ہے۔ آپ اس شخص کو ہنسانے یا بات کرنے پر آمادہ کرنے کی لاکھ کوشش کریں وہ گم سم مبہوت بنا بیٹھا رہے گا۔ کبھی کبھار غلطی سے مسکرائے گا۔ اور مسکرانے کے بعد فوراً پھر سنجیدگی اختیار کرے گا۔ جیسے اس نے مسکرا کر گناہ عظیم کیا ہے۔ اگر آپ اس سے سوال کریں تو نہایت مختصر الفاظ میں جواب دیگا۔ جیسے بات نہیں کر رہا۔ تار کا فارم پُر کر رہا ہے۔

دعوت میں بات کرنے کا سلیقہ اردو زبان کی طرح "آتے آتے ہی آتا ہے۔" تاہم جہاں تک تھیوری کا تعلق ہے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ہدایات کو مدِنظر رکھیں۔

(۱) لوگ دعوت میں تفریح طبع کے لئے آتے ہیں۔ سر درد مول لینے کے لئے نہیں آتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ شامتِ اعمال سے باتونی واقع ہوئے ہیں، تو لوگوں کے حال پر رحم کیجئے۔ نیز اپنے علاوہ کسی اور شخص کو بھی اس قابل سمجھئے کہ وہ آپ جیسی یا آپ سے بہتر بات کر سکتا ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص ڈینگ مار رہا ہے تو اس سے آپ پر یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اس سے بڑھ کر ڈینگ ماریں۔ آپ کا فرض تو صرف اتنا ہے کہ اس کی باتیں سنیں اور دل ہی دل میں مسکرا دیں۔

(۳) جب آپ کے منہ میں رس گلا یا گلاب جامن ہو تو بات کرنے کی کوشش مت کریں۔ کیونکہ بعض اوقات یہ فعل نہایت مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔

(۴) دعوت میں سمجھدار لوگ آتے ہیں۔ اس لئے حتے الوسع بے تکی باتیں کرنے سے احتراز کیجئے۔ مثلاً ایک ہی سانس میں مت کہیئے "سُنا ہے بمبئی میں ایک فیکٹری کو آگ لگ گئی، تو آپ کی پیچش کا کیا حال" ہے۔ میرے خیال میں آج ضرور بارش ہوگی۔ لیکن آپ تو بالکل گنجے ہوگئے"۔

(۵) ان تمام ہدایات کے باوجود اگر آپ دعوت میں سلیقے سے بات نہ کر سکیں۔ تو بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں کیونکہ "خاموشی معنے دارد کہ در گفتن نمے آید" نیز ایک یونانی حکیم نے کہا ہے "مجھے صرف ان باتوں کے لئے ندامت اٹھانی پڑی جنہیں میں زبان پر لایا۔ کاش کہ میں بولتا کم اور خاموش زیادہ رہتا"۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لاہور)

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

آنے لگا ہے یاد کوئی بے وفا مجھے
ملنے لگی ہے جرمِ وفا کی سزا مجھے

کچھ اپنی بے حجاب نگاہوں کا تھا قصور
کچھ تیرے التفات نے رسوا کیا مجھے

اب تجھ کو بھول جاؤں میں؟ اچھا یونہی سہی
کس طرح بھول جاتے ہیں یہ بھی بتا مجھے

پائے طلب کی خیر ہو پاتے طلب رہے
معلوم ہے حقیقتِ دستِ دعا مجھے

تم کو بھلا چکا تھا بہت مطمئن تھا میں
لو، پھر تمہاری یاد نے دھوکا دیا مجھے

تم آگئے تو ذکرِ تغافل بھی آگیا
یہ اور بات ہے کہ گوارا نہ تھا مجھے

کس نے بھلا دیا ہے کسے کچھ خبر نہیں
اب بے وفا کہے گا جہاں اُنکو یا مجھے

وابستہ ایک یاد سے یادیں ہزار تھیں
وہ آگئے تو یاد نہ کچھ بھی رہا مجھے

میرا جنونِ عشق ہے اب تک جنونِ عشق
گر ہو سکے تو اور ابھی آزما مجھے

آئے نہ اِس طرح بھی کسی کو کسی کی یاد
ہر اک سے پوچھتا ہوں میں کیا ہو گیا مجھے

بیدادِ حسن داد کی طالب رہی حفیظ
شوقِ جفا نہیں ہے تو ذوقِ جفا مجھے

احمد ندیم قاسمی

لمحہ بہ لمحہ

فرش پہ ہیٹرو کے لرزاں ہیں سلئے رقاصاؤں کے
ذہن میں جیسے گڈمڈ ہو کر ناچیں راز خداؤں کے
چھنن چھنا چھن! ــــــ اے محبوبہ! فن پر یہ آوازے کیوں؟
جس کی لَو سے پھول لجائیں اُس چہرے پر غازے کیوں؟
یوں تک جیسے چاند کی کرنیں، یوں سن جیسے ربِّ قدیر
وقت کے اِس لمحے کا تاثر عالمگیر ہے عالمگیر!

جمنا کی لہروں پہ رواں ہیں قاشیں چاند ستاروں کی
کس منزل کو لپکی یہ نورانی فوج سواروں کی
چپ شپ، چپ شپ! ــ بانکے مانجھی! تجھکو سبک واڈنڈ کی قسم
دھیرے دھیرے، ہولے ہولے، کاٹ یہ ابرو کا سا خم
یُوں مُڑ جیسے پھُول کی پتّی، یوں بڑھ جیسے سرگوشی
وقت کے اِس لمحے کا تقاضا مدہوشی ہے مدہوشی

کھیتوں کی ہریاول پر یہ دھبّے ہیں دہقانوں کے
یا گیتی نے اُگلے بوسیدہ تابوت اِنسانوں کے
سَر سَر، دھب دُھپ! ــ اے ہمراہی! چھوڑ درانتی توڑ کدال
چاک ہوئی دھرتی کی چھاتی مجھ کو اِس محشر سے نکال

چار طرف سے گھیر چکے ہیں تند خیالوں کے پیچاک
وقت کے اِس لمحے کی حقیقت آتشناک ہے آتشناک

یہ کس راجہ کی نگری ہے ڈھانچوں کے انباروں میں
جیسے اِک بلوائی کا گھر لٹے ہوئے بازاروں میں
اُلٹی سانس، اٹکتی ہچکی! — اے راہی یہ راز ہیں کیا؟
پچکے پیٹ، دریدہ رانیں! زیست کے یہ انداز ہیں کیا؟
راجہ اُٹھا ڈال کے اپنی مٹھی میں شر دا کا نظام
وقت کے اِس لمحے کا پنجہ خون آشام ہے خون آشام

معصوم اِنساں کے لاشے پر امن کا پرچم لہرایا
استبداد کی بیخ کنی میں استبداد ہی کام آیا
ہارے استبدادی تو میں، استبداد کی جیت ہوئی
پچھم کی بے رحم سیاست کب پورب کی میت ہوئی
طوفانی یلغاریں کی تھیں مشرق کے بلوانوں نے
مالِ غنیمت بانٹ لیا مغرب کے سیاستدانوں نے!

نومیدی کی دُھند میں غلطاں جگنو احساسات کے ہیں
اوس کے پرّاں قطرے ہیں یا تارے پچھلی رات کے ہیں
جگنو چاند بنے، چکرائے! آپس میں ٹکرانے لگے
جھلمل جھلمل، ڈگمگ ڈگمگ! — ہچکولے سے آنے لگے
موت سے بھڑ جانے کے ارادے اور جینے کی تیاری
وقت کے اِس لمحے کا بلاوا بیداری ہے بیداری

کمال احمد صدیقی

غزل

وہ میری اِک نگاہ تیرا شاہکار ہی نہ ہو
کسی حسین زندگی کا "اعتبار" ہی نہ ہو!

شفق! عروسِ شام کے لبوں کا آتشیں خیال
مہیب رات کا فریبِ زرنگار ہی نہ ہو!

سکوں ملا تو کتنی بھولی باتیں یاد آگئیں
سکوں کے بھیس میں بھی تیرا انتظار ہی نہ ہو!

وہ اِک نظر جو تیری سمت بار بار ہی اُٹھی
وہ میری کم نگاہیوں کی پردہ دار ہی نہ ہو!

فضا میں تتلیوں کی نرم مسکراہٹوں کی لہر
چمن کے نام کوئی مژدۂ بہار ہی نہ ہو!

پھوار کے حسین رقص میں نہ آئے زندگی
اگر یہ پتیوں پہ ہلکا سا غبار ہی نہ ہو

عدم

غزل

شام کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں
یا کسی اودی گھٹا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

ہو نہ جب میکش کوئی ہم مجلسی کو دستیاب
بیدھڑک ہر پارسا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

چاندنی راتوں میں سطحِ آب پر بہتے ہوئے
بادبانِ ناخدا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

بربط و طاؤس کا آہنگ ہی لازم نہیں
لرزشِ موجِ صبا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

راگ کی لہروں میں جب بہتی ہے نادیدہ شراب
مطربِ آتش نوا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

ساقیِ روزِ ازل کا جبر یاد آتا ہے جب
خوئے تسلیم و رضا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

وسعتِ مشرب سے کچھ احساسِ مقدس ہے عدم
بارہا اہلِ ریا کے ساتھ پی لیتا ہوں میں

غلام ربانی تاباں

"اور اک ساغرِ زہراب بھی"

اور اِک ساغرِ زہراب بھی
تلخیٔ کام و دہن کچھ تو بڑھے
آج سینے کی جلن کچھ تو بڑھے

کتنی بیرنگ ہے بزمِ ہستی
قہقہہ، اشک، فغاں کچھ بھی نہیں
شمع، پروانہ، دھواں کچھ بھی نہیں
ڈوبتی جاتی ہے نبضِ احساس
سوزاب نغمہ زنِ ساز نہیں
درد میں لذتِ آغاز نہیں
شام کے سائے ڈھلے جاتے ہیں
بام و دیوار پہ چھایا ہے سکوت
ولولے دنگ تمنا مبہوت

اور اِک ساغرِ زہراب بھی
تلخیٔ کام و دہن کچھ تو بڑھے
آج سینے کی جلن کچھ تو بڑھے

محمد حسن

یادیں

چاندنی رات کی بےچین فضائیں اب تک
زندگی چور ہے ماضی کے گراں صدموں سے
میری جانب کوئی بڑھتا ہی چلا آتا ہے
نغمگیں لہروں پہ گھبرائے ہوئے قدموں سے ---!

ایک بہکا ہوا آوارہ و تنہا نغمہ
چاندنی رات کی معصوم اداسی لے کر
کچھ الجھا ہوا ان نرم و خنک سایوں سے
درد بن کر مرے سینے میں رہا جاتا ہے

مسکراتے ہوئے چہروں نے اٹھائے ہیں نقاب
محو ہوتی ہوئی یادوں نے پکارا ہے مجھے
پھر کسی جامِ شکستہ میں سُلگتی ہے شراب
آج پھر زہر وہی زہر گوارا ہے مجھے

سردار انور

رات کو

سلگتی شام کے سائے بڑھے! کچھ اور! کچھ اور!
شفق کے بجھتے شرارے بجھے! کچھ اور! کچھ اور!
درخت سو گئے جھونکوں کی لوریاں سن کر
چمن میں اوس کی فریاد جاگ اُٹھی ہے

وہ تیرے گیسوئے مشکیں کی نرم رو لہریں
اندھیرا مجھ کو سرکتا ہوا نظر آیا
فلک سے جھانکتے تارے بکھر کے جانے لگے
تھرکتے قدموں کی آہٹ مگر نہیں آئی
اُداس رات کی اب تک سحر نہیں آئی

سحر وہ اُس کا دمکتا ہوا حسیں چہرہ

گداز ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کی چھنک
نظر میں کھلتے ہوئے شوق کے شگوفے کبھی
جبیں پہ خوف کے ہاتھوں سے شبنمی ٹھنڈک

اُداس رات میں وہ ایک قہقہہ ہی تو ہے
جو دل سے غم کے دھندلکے کو دور کرتی ہے
تعینات کی دنیا سے جب گذرتی ہے

یہ نکہتوں کی لپیٹ کس طرف سے آتی ہے
یہ کون سرمئی آنچل سے منہ چھپاتی ہوئی
نصیبِ خفتہ کا شانہ جھنجھوڑتی، بیباک
در آئی ہے میری خلوت میں مسکراتی ہوئی

قیوم نظر

ایک نظم اور ایک گیت

بہار

تمام عمر جس سے میں جھجکتا بھاگتا رہا
وہی نگارِ روز و شب —— جمالِ آفریں سحر
نئی ادا سے آج پھر چمن میں جلوہ گر ہوئی

ہر ایک برگ و شاخ سے جھلک رہی ہے تازگی
شعاعِ مہر سے لپٹ کے کتنے دانے اوس کے
بنے ہوئے ہیں پارہ ہائے برقِ آتشیں نفس

وہ مجھ سے کہہ رہی ہے دیکھ تو دمیدہ گھاس بھی
کسی کلی سے لمس کے خیالِ تابناک میں
زمین کے سینۂ سیہ کو چیر کر نکل گیا

ہزاروں خوش نوا طیور اپنے اپنے رنگ میں
فضا میں پھیلتی صداؤں کو اچھالتے رہے
جنوں کا پیچ ڈال کر اُسے سنبھالتے رہے

وہ مجھ سے کہہ رہی ہے دیکھ سرخوشی کے ساز پر
ہوا کی سلوٹوں پہ کس طرح سے موجِ زندگی
مچل رہی ہے، ناچتی ہے، گا رہی ہے بیخبر

وہ مجھ سے کہہ رہی ہے دیکھ وقت پھر گذر نہ جائے

گیت

پون چلی جھومے ہریالی

ناچ رہی ہیں کومل کلیاں
بھونرے کا جی ڈول رہا ہے
پی کی بولی بول رہا ہے
پتّہ پتّہ ڈالی ڈالی
پون چلی، جھومے ہریالی

سندرتا کی پھوٹیں کرنیں
دُور ہوا پاپی اندھیارا
مہکانے نکلا جگ سارا
من کے چنچل باغ کا مالی
پون چلی، جھومے ہریالی

سوکھ چکے ہیں اوس کے موتی
آشاؤں کا پھیلتا جادو
لے ہی گیا آنکھوں سے آنسو
آ ہی گئی پھر رُت متوالی
پون چلی، جھومے ہریالی

منظر سلیم

ارادہ ــــــ

رات کی بات مری جان کوئی بات نہیں۔
حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں طرب زاروں میں
شکر کر اپنے شبستاں میں تری انگڑائی
صرف ٹوٹے ہوئے تاروں کی گذرگاہ بنی
تجھ کو معلوم ہے کس طرح حسین نیندوں نے
آہنی کانٹوں کی آغوش میں دم توڑا ہے
ان گنت خوابوں کو پیمانوں کو انسانوں کو
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں نے کچل ڈالا ہے
گرم ہاتھوں نے محبت کے بہانے اکثر
سونگھنے سونگھنے پھولوں کو مسل ڈالا ہے
تیری جیسی ہی تو آزردہ جوانی ہوگی
جس کو انگڑائیاں لینے کی بھی فرصت نہ ملی
رات کی بات مری جان کوئی بات نہیں
اور ٹوٹے ہوئے تاروں سے نفرت ہے مجھے
میری ہمدم یہ کشاکش یہ ندامت کیسی
میں نے تجھ سے تو کسی بات کا شکوہ نہ کیا
تو ابھی سو کے اُٹھی ہے تری انگڑائی میں
اک نیا لوچ نیا رقص ہوا ہے پیدا
اس نئے لوچ نئے رقص کی تقدیر نہ سوچ
خواب کو یاد نہ کر خواب کی تعبیر نہ سوچ
یہ سحر رات کا ٹھکرایا ہوا جام نہیں
یہ سحر کچھ بھی سہی، موت کا پیغام نہیں

مسعود شاہد

عادتیں

اور کچھ دُور سہی لوٹ کے جانا ہی تو ہے
اِس قدر دُور تو پہلے نہ کبھی آیا تھا
دُور ہی دُور بڑھا آتا ہوں تھمتا ہی نہیں
اب نہیں جاؤں گا میں ایک قدم بھی آگے
اب جو جاؤں گا تو بس لوٹ کے آنے کے لئے

پہلے کچھ دُور بھی آتے ہوئے ڈر لگتا تھا
ہر قدم ایک تذبذب کا قدم ہوتا تھا
یعنی اب آگے بڑھوں، پیچھے مڑوں، آگے بڑھوں؟

اب وہی میں ہوں کہ چلتا ہوں چلا جاتا ہوں
اب قدم بڑھتا ہے جس سمت بڑھا جاتا ہے
اب قدم اُٹھتا ہے اک بار تو رکتا ہی نہیں
آنا آسان تھا اب جانا بہت مشکل ہے

جی میں آتی ہے کہ رہ جاؤں یہیں کا ہو کر
ایک دن آنے ہی والا ہے کہ یہ منزل بھی
پیچھے رہ جائیگی، ہاں دُور بہت دُور بہت ــــ
ابھی پھر لوٹ کے آنا مجھے مشکل ہوگا

سوچتا ہوں کہ یونہی منزلیں طے کرتے ہوئے
میں خدا جانے کسی وقت کہاں جا پہنچوں
اور رہ جاؤں وہیں حصۂ منزل ہو کر

سجّاد حیدر

رُوٹھ گئے دُکھیارن کے پی

رُوٹھ گئے دُکھیارن کے پی ڈھونڈت ہوں اب گلی گلی
انگ اُنگ میں آس ملن کی جیسے باس ہو کلی کلی
بھڑ بھڑ پریم اگنی کی لاٹوں میں میں باپن جلی جلی
پل پل گونجت ہیں کانوں میں پی کی باتیں بھلی بھلی
رُوٹھ گئے دکھیارن کے پی۔

سکھ سنسار کے سُندر سپنے سو گئے ساجن آہ سسک سسک
چاہت چین کے چنچل چھینٹے چھاگل سے گئے چھلک چھلک
ہر ہارت میں بیاکل نیناں بھرم گنوائیں پلک پلک
جاگ جاگ کٹتا ہے جیون مندھ گئیں آنکھیں جھپک جھپک
رُوٹھ گئے دکھیارن کے پی۔

تھوڑے دِن کی پریت کرن کو کیوں آئے تھے کھڑے کھڑے
من میں جوت جگا کر بالم! اب رہتے ہو پرے پرے
بِن بھکاری تجھ بن پیتم! یوں رہتے ہیں بھرے بھرے
سہمے سہمے ساون میں ہوں جیسے بادل ڈرے ڈرے
رُوٹھ گئے دُکھیارن کے پی۔

لطیف انور

قطعات

ہر نفس حشر در کنار سہی
جس طرح بن پڑے گا جی لوں گا
تو جو حق بات سُن نہیں سکتا
اے زمانے میں ہونٹ سی لوں گا

اے زمانے نہ مجھ سے برہم ہو
تیرا ہر ظلم سہہ لیا میں نے
جب زباں پر کوئی گلہ آیا
اپنے دل ہی سے کہہ لیا میں نے

قافلہ زندگی کا دم لے گا
وقت کچھ اور بیش و کم لے گا
خود پکارے گی منزلِ مقصود
جب زمانہ مرے قدم لے گا

سوچتا ہوں مآلِ نغمہ و گل
ہاتھ ڈالے ہوئے گریباں میں
میں ترے انتظار ہی میں رہا
پھول مرجھا گئے گلستاں میں

بیگم 'ف' الف'

تالیاں

"اچھا! یہ تو حسینی بوا چلی آ رہی ہیں۔ آج کدھر راستہ بھول پڑیں۔ ایک دیوار بیچ گھر اور تم یوں دنوں غوطے لگا جاتی ہو"۔

حسینی بوا دروازے ہی سے واری قربان ہستی چلی آ رہی تھیں۔ ذرا اور گلے پر زور دے کر بولیں۔

"بیگم قربان جاؤں۔ فرصت بھی تو ملے۔ نگوڑا اپیٹ کا دھندا تو تھا ہی، کوئی آٹھ دن سے میرے نواسے ببن کو بخار آ رہا ہے۔"

حسینی بوا کی آواز سن کر گلشن ماما باورچی خانہ سے لپکتی ہوئی نکلی "میرا کرتا لائیں بوا۔ دیکھو تو کتنے دن ہو گئے"۔

"لو بی یہ اور سنو، دعا نہ سلام خیر نہ خبر۔ اس مردار کو اپنے کرتے ہی کی پڑی ہے"۔ حسینی بوا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"کیا کریں دیکھو اس کرتے کی بھیریں لگ گئیں۔ پھر بھی تم نے ابھی تک نہ سیا"۔ گلشن نے تیز ہو کر کہا۔

"چل خندی" حسینی بوا نے ناک سکیڑ کیا "اٹھا لا اپنا کرتا۔ مجھے نہیں سینا۔ ایک تو ان نگوڑیوں کا کام کرو۔ اوپر سے دھونس سہو۔ نابی بی"

بیگم بات کاٹ کر بولیں "ہو گا ہاں یہ بتاؤ اب تمہارا نواسہ کیسا ہے؟ اے اچھی طرح بیٹھو۔ برقعہ تو اتارو سر سے۔"

"اب تو اچھا ہے۔ بس کل ہی کی تو باری ٹلی ہے۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) بڑا سناٹا سا ہے۔ منجھلی صاحبزادی کہاں ہیں؟"

"بوا! وہ تو اپنے گھر خیر سے پرسوں گئیں"

"اے ہے! مجھ کمبخت کو تو دیکھو میں صاحبزادی سے مل بھی نہ سکی۔ بیوی اُن کی دلائی تو میں نے تیار کر دی تھی۔ صرف مُرمُرا ٹانکنا رہ گیا ہے۔ سنجاف پر دھنک کی چڑیاں ڈال دی ہیں۔ مجھے خبر ہو جاتی تو وہ بھی ٹانک ٹونک کر دلائی بچی کے حوالہ کرتی"۔

"آہا حسینی بوا ہیں۔ سلام بوا" سامنے والے دالان سے آواز آئی۔

"خوش رہو دلہن دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو"۔

بیگم نے کہا "بڑی دلہن یہاں تو آؤ۔ سنو وہ اپنا جالی والا دوپٹہ ان کو دے دو اور لچکہ اور مسالہ بھی دے دو۔ یہ نہ تیار کر سکیں گی تو ان کی بیٹی امانی خانم ان سے کچھ کم ہنرمند نہیں ہیں تمہارا دوپٹہ بہت ہی سجیل اور بہار دار تیار ہو جائے گا۔

"ہاں ہاں دلہن بیگم دکھاؤ کون کون سا گوٹہ مسالہ منگوایا ہے میں خود بھی تمہیں جوڑ لگا کر بتا دوں گی"۔۔۔

نزہت اور ریحانہ دوڑتی ہوئی آئیں "مغلانی بی ہماری گڑیا کے کپڑے کب سیو گی۔ نہیں بھئی ہماری گڑیا کے کپڑے سی دو۔ تم بہت دنوں میں آتی ہو"

"اللہ توبہ، بچی گڑیا نگوڑی انسانوں سے زیادہ ہوئی۔ لو مجھے پوری بات بھی نہ سننے دی ۔۔۔ (دوسری طرف مخاطب ہو) دلہن مقیش ضرور منگوا لینا۔ مگر دیکھنا اُس کا تار لکھنؤ کا ہو نہیں تو ۔۔۔"

"اتنے دن سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری گڑیا کی شادی ہے"۔ ریحانہ بات کاٹ کر بولی۔

"بیگم دیکھنا۔ یہ بچیاں تو منہ نوچے لیتی ہیں۔ نوج۔ توبہ توبہ"۔

"تم یہ کیوں نہیں بتاتیں کب ہو گی"۔ ریحانہ ٹھنک کر بولی۔

"لو دیکھو یہ سب لچکہ مقیش۔ چٹکی وغیرہ ہے"۔ دلہن نے صندوقچی حسینی بوا کے سامنے رکھ دی۔

"بوا کب سیو گی"۔ ریحانہ نے پھر وہی جملہ دوہرایا۔

"اے کیا دیکھوں۔ میں نگوڑی تو باؤلی ہوئی جاتی ہوں۔ توبہ آج کل لڑکیاں۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) اسی مارے تو اور بھی میں نہیں آتی۔

بیگم نے ڈانٹ بتائی "نزہت کیا بات ہے۔ کیوں بولا سولا

سے گذری جاتی ہو۔ دم تو لو۔ میں سلوا دوں گی تمہاری گڑیا کے کپڑے۔"

"بیگم انہیں خود سینا چاہئیں۔ گڑیوں ہی سے سینا پرونا آتا ہے لڑکیوں کو۔ بنّو ڈھنگ سیکھو۔"

یک نہ شد دو شد آتا ادھر سے بڑی دلہن کے بچے کو لئے ہوئے آ پہنچی۔

"بوا سلام۔ تم تو بہت دن میں چمکیں۔"

اوئی جُرھا۔ چمکے تو۔ (ناک سکیڑ کر) اللہ ماری کیا بولا چالی ہے بڑ دھنگی کہیں کی ——"

"لو تم تو برا مان گئیں۔ میں نے تو پوچھا۔ میری لونڈیا نگوڑی پھٹا غرارہ پہنے پھرتی ہے۔ اس کا غرارہ سی دو تو اچھا ہے۔"

"پوچھنے کی بات کیا ہے۔ ٹکے تو دے گی۔ سیو دوں گی میں۔ کچھ ہے کہ نہیں آ گئی مغز چاٹنے۔ میں تو دو گھڑی کو بیگم کو دیکھنے چلی آئی۔ بات تک نہیں کرنے دیتیں نگوڑی ماریاں —— اور نہیں تو ہاں جاؤ جی تم اپنا اپنا کام دیکھو۔ ابھی تو ان کا نواسہ بیمار ہے۔ ہاں۔" "حسینی بوا کہو کچھ اور سناؤ ——" بیگم نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"بیگم۔ اللہ رکھے ڈپٹی صاحب کتنے دن سے دکھے نہیں!"

"وہ تو دورے پر گئے ہیں کہو تمہاری چھوٹی بیٹی کا کیا حال ہے کیسی ہے۔"

زندہ ہے بیوی۔ حال کیا وہی خاوند نگوڑے کا رونا ہے۔

"سچ کہتی ہو" بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "خدا بیٹیوں کا نصیب اچھا کرے۔"

"بس بیگم سب میں بڑی بات یہ ہی ہے —— اے دیکھنا بیوی نگوڑی شبراتن بھلی چنگی دو دن میں چٹ پٹ ہو گئی۔ ننھے ننھے تین بچے چھوڑے —— ہا!"

اے یہ کب، بیگم نے حیرت سے پوچھا۔ "رنج ہوا۔ بہت بے زبان تھی نگوڑی۔"

"ہاں بیوی۔ سائیں کے سو کھیل۔ جو چاہے سو کرے۔"

ایک بڑھی سی بیوی تسبیح پڑھتی ہوئی۔ بیگم کے پاس آن بیٹھیں بیگم نے کہا "سنا آپا شبراتن بچاری مر گئی ——"

اے ہے۔ کیا ہوا تھا اُسے۔" پھر تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرنے لگیں۔

حسینی بوا نے سینکڑوں شکنیں اپنے چہرے پر ڈال کر کہا۔

"بس کیا کہوں ——"

"خیر بیوی۔ اللہ بچائے —— ہاں یہ تو بتاؤ اب تمہیں فرصت کب ہو گی۔ تمام سلائی پڑی ہے۔ حسنہ بیگم کی خیر سے شادی ہے نا؟"

"میں صدقے گئی بیگم کب ہے شادی؟" حسینی بوا نے اپنا چوڑا دہانہ پھیلا کر کہا۔

"اگلی عید تک۔"

"بس بیگم یہ ہی پندرہ دن سمجھو۔ پھر فرصت ہی فرصت ہے۔" پھر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اِدھر اُدھر گھما کر بولیں۔ اے ہاں چھوٹی دلہن کہاں ہیں کیا میکے گئیں؟"

"حسینی تمہارا یہ چندرانا مجھے تو زہر ہی لگتا ہے۔" دوا خوبن نے ہاتھ مٹکا کر کہا۔ "بوڑھی ہونے آئیں۔ جان بوجھ کر بھولی بنتی ہیں۔ بچاری ننھی نادان۔"

"اے خوبن، میں نے کہدیا۔ ہاں۔ مجھ سے بڑھ بڑھ کر نہ بولا کرو۔ اپنے بوڑھے چوچلے اپنے ہی پاس رکھو۔ مجھے نہیں بھاتے چندراتی ہو گی تم۔ پڑی بچاری واہ وا۔" حسینی بوا کا پارہ تیز ہو گیا۔

"میں کیوں کرنے لگی تھی چوچلے تم سے۔ مجھے کیا پڑی ہے۔" خوبن دوا نے تنک کر جواب دیا۔ "بات سمجھی نہیں جروا اور لگی جلنے۔ جیسے مرچیں لگ گئیں نازو کے۔"

"دیکھو خوبن۔" حسینی بوا نے تلملا کر پاٹ دار آواز گلے سے نکالی۔ "میرے منہ نہ لگنا۔ بات بڑھ جائے گی نہیں تو مرچیں تو تمہارے لگتی ہیں۔ میرا آنا بیگم کے پاس بس قیامت ہے۔ تم کو تو کوئی دوسرا سہاتا ہی نہیں۔"

"ارے کیوں لڑتی ہو آپس میں۔ چپ ہو جاؤ دونوں تم ہی۔" بیگم نے کہا۔

"ان ۔۔۔ کہ ستارہ آپس میں ملتا ہی نہیں۔ بے بات کٹی مرتی ہیں۔ منتو ۔۔۔ اُونہہ!" یہ کہہ کر آپا اپنی طرف چلی گئیں۔

"حسینی بوا چھوٹی دلہن اپنے کمرے میں دولہا کے پاس ہیں"۔ بڑی دلہن نے ہنس کر کہا۔

"اچھا" ۔۔۔ حسینی بوا نے 'اچھا' کے الف کو لمبا کھینچا۔ "اے بیگم مجھے ۔۔۔ بُرا کہہ لو۔ مگر بیوی مرد کے گھٹنے سے ہر دم لگا رہنا۔ کچھ اچھا نہیں۔ مرد کا دل الگ بھر جاتا ہے۔ عورت کو الجھن ہوتی ہے سو الگ ۔۔۔ نگوڑی صحت کا بھی خرابہ ہے ۔۔۔ روگ لگ جاتے ہیں روگ۔ کیا بتاؤں۔ بچیاں بیٹھی ہیں۔ رقیہ بی بی کو نہیں دیکھا۔ کیسے کیسے چاؤ چوچلے۔ پھر کیا دق ہو ہو کر ہی تو مریں"۔

"ارے تو یہاں ان کو جلاتے تھوڑی تھے۔ ایسا میاں کیا گہنہ۔ وہ تو کچھ بیماری ہونی تھی ہو گئی"۔۔۔ خوبن پھر بول پڑیں۔

"میں کب کہتی ہوں بہن۔ زیادہ ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں بڑے بڑے روگ لگ جاتے ہیں۔ ہم تو بیوی یہ ہی بڑی بوڑھیوں سے سنتے چلے آئے۔ اللہ ان بیگم کو رکھے ان کی ساس کو ان باتوں کا بڑا لحاظ تھا۔ بیٹوں کی کیا مجال جو گھر میں زیادہ ٹھہر سکیں۔ وقت سے آنا وقت سے جانا ۔۔۔"

"جب کی کیا بات تھی"۔ خوبن بولیں "شرم تھی۔ بڑوں کا خیال تھا"۔

"ہاں سچ کہتی ہو۔ حسینی بوا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل کی عورتوں کے دیدے کا پانی ڈھل گیا نگوڑا"۔

"بوا" بڑی دلہن نے ہنس کر کہا۔ "مردوں کو کچھ نہیں کہو گی"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں"۔ حسینی بوا نے گردن مٹکائی "مرد بھی بے شرم ہوتے ہیں"۔

"مجھے تو بوا اس کا خیال نہیں۔ نئی عمریں ہیں۔ نیا زمانہ ہے"۔ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

"بیوی نئی عمریں وقت وقت سے سبکی ہوتی ہیں۔ اپنا آپا ڈھل گیا۔ کوئی روگ لگ گیا تو بس گئے جنم جنم کو ۔۔۔ بیگما کے میاں کو نہیں دیکھا۔ کیا عمر ہے۔ کھچڑی سر ہو گیا۔ نگوڑا پیلا آم ہو کر رہ گیا"۔ حسینی بوا نے بڑی متانت سے کہا۔

"خدا بچائے ایسی عورتوں سے بوا" بیگم بولیں "بہتوں کو تو مردوں کا بڑا دھڑا ہوتا ہے"۔

"اے بیوی میں بتاؤں" حسینی بوا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولیں "خدا بخشے مرزا جی کو الہی کروٹ کروٹ پھول برسیں۔ میں کہوں ایسا چاہنے والا خاوند کل جہان کی بیٹیوں کو ملے۔ ایک دفعہ جنے کیا جی میں آئی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ نیکبخت کبھی گھڑی دو گھڑی میرے پاس جم کر بیٹھا کرو۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ بس بیوی (ابا چھوں سے پان کی پیک پر چھتے ہوئے) اتنا کہنا تھا پھر آگ تو جا کہاں ہیں سر سی تو ہو گئی۔ میں نے کہا سنو مرزا جی جم کر پاس بیٹھنے والیاں کوٹھوں پر ملتی ہیں کہ تمہارے جیسے مردوں کے ساتھ گل چھرے اڑائیں۔ میں کیا جانوں یہ سب باتیں گھر میں بیٹھنے والی بچاری گرہستن۔ میرے پیچھے خدا رکھے بچوں کا بھی تو دھندا تم نے ہی لگا دیا ہے۔ اور گھر گرہستی کے سینکڑوں کام پکانا ریندھنا۔ سینا پرونا۔ تمہارے آرام کا خیال تم تھکے ماندے کام سے آؤ گے کہ دو گھڑی چین ملے۔ یہ تو نہ ہوا اور میں ہر وقت تمہارے سر پر سوار ہوں۔ عورت نہ ہوئی ہتھنی ہوئی واہ۔ واہ۔ وا۔ اچھی کہی۔ تم مردوئے عورتوں کی قدر کیا جانو۔ عورت مٹ جائے۔ مگر تم لوگوں کے بھاویں ہی نہیں۔ چلو رہنے دو۔ مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ کیا میں آئی لگائی" ہوں کہ جتنا ساتھ ملے چلو اچھا ہے ۔۔۔ ارے میرا تمہارا تو آخیر تک کا ساتھ ہے۔ اے بیوی اُس کے بعد مرتے مر گئے اُس جنت کے میاں نے کبھی زبان نہ کھولی۔ کہنے کو مجھ پر دم و ہوش فدا تھے۔ تندرست توانا ایسے کہ چہرے پر رنگ ترے ٹوٹتے تھے۔ اے خوبن بہن دیکھا تھا نا تم نے ۔۔۔ دور کیوں جاؤ بڑھاپے میں بھی آج کے جوانوں سے ٹانٹھے ہی تھے"۔

خوبن نے گول گول سی آنکھیں گھما کر کہا "ہاں، ہاں اور نہیں کیا"۔

"میں کہوں" حسینی بوا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "جب یہ دولہا بنے تھے۔ کیا حسن کیا نور چمکتا تھا۔ واہ واہ" اور حسینی بوا کی بوڑھی آنکھوں میں چمک سی آگئی "آجکل

گے لونڈوں کو دیکھو چڑھتی جوانی، گال پچکے - اجڑی ہوئی رنگتیں۔ رنگ نہ روپ پھٹکار مارے۔ اے نوج !!" مرزا جی کے دولہا بننے کے تذکرے پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں کہ اتنے میں خوبن انگلی مٹکا کر بولیں "ڈھڈو کو بڑھاپے میں سنک آرہی ہے" پھر بات کا رخ بدل کر کہنے لگی "بات یہ ہے حسینی بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے پیسہ ہے روپیہ ہے - سو طرح کے آرام"۔

"اور کیا بیوی"۔ حسینی بولیں "غریب دکھیا یہ نخرے کیا جانے۔ اُسے تو پیٹ کی مار ہی ایسی ہوتی ہے سب چوکڑیاں بھول جاتی ہے"۔

خوبن نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا "بس تو"۔

"اے نہیں دوا اس میں غریب امیر کیا لائے"۔ بیگم جو ابھی تک ڈلی کتر رہی تھیں اور ان دونوں کی باتیں زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھیں بولیں "یہ تو اپنی اپنی طبیعت ہے - اپنے ڈپٹی صاحب کو دیکھو - زیادہ وقت اُن کا باہر ہی گذرتا ہے" اور پھر حسینی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں "تم جانتی ہو ماموں ابّا کا کاروبار سب باہر ہی تھا۔ کچھ یہ نہ تھا کہ ممانی اماں پھوہڑ تھیں یا بے ڈھنگی تھیں"۔

"نہیں بیگم، بھلا آپ کی ممانی اماں، کیا رعب داب کیسے ڈھنگ اور سلیقے کی بیوی تھیں - سبحان اللہ - ہزاروں میں ایک"۔

بھئی سنو۔ بیگم نے کہا "آج کل کی لڑکیاں یہ سمجھتیں ہیں کہ ہم جتنا اپنے میاں کے ساتھ رہیں گے، بیوی خواہ میری بیٹیاں ہوں یا پرائی اُتنا ہی میاں کو ہمارا خیال ہوگا ـــــ،

خوبن نے کہا "میری بیگم یہ سب کہنے کی باتیں ہیں"۔

"اے تو کیا بڑی بیگم ہوئیں آپ کی ممانی اماں ہوئیں - خدا بھلا کرے سینکڑوں بیویاں ان آنکھوں نے دیکھیں - میاں کی وہ وہ چاہتیں کہ نظر لگے بیویوں کے موے پہنتے تو ہم نے دیکھا، بیوی کو سر پر سوار آٹھوں پہر نہ دیکھا - ساس نندیں ہوئیں تو خیر نہیں تو نگوڑا گھر واہا اوندھا پڑا ہے - توبہ یہ تو گھر والیوں کی حالت نہ ہوئی ـــــ نگوڑی چہروں کی رونقیں اُڑی ہوئی ــ !!"

"حسینی بوا بات یہ ہے کہ زیادہ باہر رہنے سے مرد بدچلن ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے تو آج کل کی عورتوں نے قابو میں رکھنے کے لئے یہ ڈھنگ رچایا ہے"۔ بڑی دلہن نے ذرا شوخ لہجہ میں کہا۔

"دلہن بیگم صدقے گئی کیا کہتی ہو۔ عورتوں کے روکے کہیں مرد بچہ رکا ہے - چاہے تو سب کچھ سر پر بیٹھ کر بھی کر سکتا ہے۔ ـــ اور یوں تو میری بنّو کونسی کشمکش ہے جس میں تنکا نہیں۔ ہزاروں چاہنے والے خاوندوں کو دیکھا نہ چاہنے والوں کو بھی دیکھا ان تم ہی بیویوں کے گھروں کے رنگ روپ دیکھے پڑے ہیں۔ مگر ڈھنگ سلیقہ ہر بات میں ہونا اچھا ہے میری بچّی !!"

"ہاں بھئی سچ کہتی ہو"۔ بیگم نے کہا۔

اتنے میں دفاتی ملازم لڑکا باہر سے بیگم صاحبہ کے پاس آیا اور کہنے لگا "بیگم صاحب، بڑے صاحب نے کہا ہے کہ وہ کھانا باہر ہی کھائیں گے - دو صاحب اور اُن کے ساتھ ہیں"۔

"لو دلہن جاؤ دیکھو باورچی خانہ میں جا کر۔ تمہارے میاں باہر ہی کھانا کھائیں گے"۔

"جی ہاں ٹھیک ہے - میں کھانا بھیجدوں گی"۔ دلہن وہاں سے فوراً ہی جانا نہیں چاہتی تھیں۔

"آپ نے سن لیا دلہن بی صاحب - میں جاؤں"۔ دفاتی نے ناک سڑکتے ہوئے اور انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

"چل دور ہو مردے ایک رٹ لگادی - سن لیا - سن لیا"۔ منہ چڑا کر حسینی نے کہا۔

"تم سے کون بول رہا ہے حسینی بوا یوں ہی" ـــــ دفاتی کسمسایا۔

"مجھ سے کیا بولے گا موت پڑے ــ گنوار"۔ حسینی کو جیسے اُس سے للہی بغض ہو۔

"واہ جی واہ یوں ہی ناحق کو گالیاں دے رہی ہو - بھیڑ میں"۔ یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو خوبن بول اُٹھیں۔

ارے دفاتی سن رے - تیری بہن پدیوں کا سایہ تھا ناؤس کی بیٹھک کب ہوگی"۔

"مجھے نہیں پتا"۔ دفاتی نے جل کر جواب دیا اور باہر چل دیا۔

"اے ہے کمبخت سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ تیسرا کالا منہ
تو بی کیا مُسما لڑکا ہے۔ خاک پڑے۔ اُہنہ !!"

"کیا کہہ رہی ہو خوبن"۔ حسینی نے دریافت کیا پریوں کا
سایہ !۔۔۔ اے کس پر "

"اس کی بہن لطو ہے نا"۔ بیگم بولیں۔

"اے بیگم کہاں پریاں کہاں لطو۔ ارے اُس کے چھوئے
تو کوئی بیر بھی نہ کھائے۔ نگوڑی منحوس چمرخ۔ ڈھونگ ہے
ڈھونگ۔ پریاں اور جنات ایسی سڑاندیوں پر تو بہت آئے۔
کوئی بھوت پریت ہوگا بھتنی پر"۔

"حسینی تم باتیں ایسی کر دیتی ہو جی جل جاتا ہے۔ کیا حسن دار ہی
پر ہی جنات آتے ہیں۔ میری پھوپھی تو معمولی رنگ روپ کی عورت
تھیں، بیگم صاحبہ! مگر اُنہیں آخر جنات لے ہی گئے۔ ہزار
ہزار تعویذ گنڈے ہوئے کوئی ملا اور سیانا نہ بچا پردہ نہ گئے
نہ گئے "

بیگم نے کہا "ہاں وہ! اُنہیں تو کوئی لشکا پسند آ جائے
بس "

"یہ میں کب کہتی ہوں، حسینی بوا نے جیسے ہار مان لی ہو" مگر
لطو تو بیگم پریوں کے لائق نہیں۔ میرے رشتہ کی نند ولایتی خانم
تھیں۔ تم جانو مغل بچی رنگ جیسے میدہ اور شہاب سا پان کھاتیں
تو پیک گلے میں در سی، جنات ایسے عاشق ہوئے، ایسے عاشق
ہوئے کہ دنیا کو حیرت تھی۔ اور پھر ایک دن خوب زوروں کی
آندھی آئی۔ اندھیر اگھپ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اللہ تیری پناہ!
تو بیوی وہ بیٹھے ہی بیٹھے غائب۔ سارا گھر سارا محلہ پڑوس
چھان مارا پر وہ نہ ملنی تھیں نہ ملیں۔ تو اللہ ہی بچائے ان
بکھیڑوں سے یہ بہت برے ہوتے ہیں" اور پھر رازدارانہ لہجہ
میں کہنے لگیں "تمہارے اس گھر میں بھی کچھ ہے"

بیگم نے حیرت سے حسینی کا منہ دیکھا اور بولیں کیا کہتی ہو"
یہاں تو کچھ بھی کبھی نہ معلوم ہوا "

حسینی بوا بولیں "بیوی مجھے تو معلوم ہوتا ہے میں نے تو اپنی
کانوں سے آوازیں سنی ہیں "

اُدھر سے خوبن بولی "کیا جناتوں کی آوازیں۔ اللہ کی سنو
سننے والی کا بھی بڑا دیدہ ہے۔ ہے ہے میرے تو رونگٹے کھڑے
ہوتے ہیں "

حسینی بوا نے کہا "بہن مجھے تو کئی مہینے ہو گئے یہ سب
دیکھتے سنتے۔ تم جانو میں تو راتوں کو کتنی کتنی مرتبہ اُٹھتی ہوں جاگ
پڑی جاگا کرتی ہوں۔ چھوٹی دلہن کی چھت سے میری چھت ملی
ہے۔ ایک دیوار بیچ ہے۔ اذانوں کے وقت بھی تو آوازیں
سنائی پڑتی ہیں "

"اے حسینی بوا، مجھے تو خود حیرت ہے۔ میں نے کبھی کو
آواز کوئی کھٹکا یا پرچھائیں نہ دیکھی آج تک"۔ بیگم نے کہا۔
کندن چھوکری کی جو شامت آئی تو وہ بول پڑی۔

"کاہے کو بوا ہم بھی تو دلہن بی کی چھت سے لیکر چھت
چھت پر سوتے ہیں۔ تم بھی ایسی باتیں کرتی ہو "

"چل مردار تو کیا سنے گی۔ بھینس سی پیر پھیلا کر سوتی ہے
تو نمازوں کے لئے اُٹھتی رہتی ہوں"

"ہوگا بھیا ہمیں نہیں معلوم، کندن غریب یہ کہہ کر چپ ہو

"نہیں بیگم یہی آوازیں ایک دفعہ اور بھی میں نے سنی تھ
وہ جب بڑی صاحبزادی اور ان کے دولہا میاں رہتے تھے
میں نے جب دھیان نہیں کیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اور تمہار
خلیا ساس مقبول بیگم صاحبہ وہاں رہیں۔ روزہ نماز ہوتی رہ
تو کوئی ذرا بھی کھٹکا نہ تھا۔ اب پھر جب سے چھوٹی دلہن ر
لگیں۔ پھر وہی آوازیں آنے لگیں"

بیگم بات تو کچھ ٹھیک سی ہے۔ خوبن نے کہا "چھو
دلہن بچاری پیلی پڑتی جاتی ہیں۔ دشمنوں کو کچھ اثر نہ ہو جا
"اے تو کیا آوازیں ہیں حسینی! جنات باتیں کرتے ہیں۔ اوئی بیو

"نہیں بیوی باتیں کیسی ہیں۔ ایسی چٹاخ، چٹاخ تالیاں
ہیں۔ کہ میں کیا بتاؤں" اور حسینی ہاتھوں سے تالیاں بجا کر
لگی "اے ہے میرے ہاتھوں میں کمبخت زور بھی تو نہیں۔ ا

۔۔۔ کہیں آ دانہ دارے"

"اے لیا تمہارے کان بجتے ہوں گے۔ تالیاں کہاں بجیں گی"

"کندن تو بے فضول باتیں نہ کیا کر۔ ۔ میں نے اکیلی نے سنا ہے؟

۔۔۔ بیسیوں بار تو میرے نواسے نے مجھے بتایا کہ دیکھو تالیاں پٹ رہی ۔۔۔ ہیں۔ اب تو وہ ڈر کے مارے میرے پاس ہی لیٹتا ہے اور ۔۔۔

۔۔۔ ے تو دلہن بی آگئیں۔ میں صدقے گئی۔ اے بیٹی تمہارے کوٹھے ۔۔۔ مجھے تو جنات معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں نہ سویا کرو بیٹی"

"تمہیں کیسے معلوم تھا" چھوٹی دلہن بولیں "ہم نے تو کبھی کچھ نہیں دیکھا"

"لو، اور سنو، بیوی تین مہینے سے تو روز رات کو کتنی بار پٹا پٹ تالیاں پیٹتی ہوئی میں خود سنتی ہوں اور میرا نواسہ بھی سنتا ہے گئی رات تو موئے دس بھی نہ بجے تھے کہ چٹاخ چٹاخ آوازیں آنے لگیں۔ توبہ میرا دل تو دہشت سے اُڑا جاتا ہے۔ وہ تو یہ کہو۔ کہ سورہ جن کی دو چار آئتیں یاد ہیں پڑھ کر حصار باندھ لیتی ہوں"

چھوٹی دلہن کا پیلا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھوں کے پپوٹے گلابی ہو کر بوجھل پڑ گئے۔

ہنس راج رہبر

حرکت

فضل دین نے بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر سامنے پڑی ہوئی مٹی کی ڈلی کو دیکھنے لگا۔ مٹی ہی کی ڈلی تھی یہ شاید۔ شاید کا نقطہ اس کے ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں چپکا ہوا تھا۔ اور اسے یوں کھٹک رہا تھا جس طرح کسی کی آنکھ میں معمولی، بہت ہی معمولی سا تنکا پڑا ہو۔ جو درد کا باعث بھی نہ ہوا۔ اور وہاں اسکی گنجائش بھی نہ ہو۔ آنکھ ذرا مَل دی اور بس۔ وہ بھی تو اس ڈلی کی طرف دیکھ کر سوچ لیتا تھا مٹی ہی تو ہے۔ ٹھوس، ساکن اور جامد لیکن اس کا رنگ مٹی کا نہیں مٹی جیسا ہے۔ رنگ کا تصور شاید کو پھر نمایاں کر دیتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک کنکر اٹھایا۔ شست باندھی لیکن نشانہ چوک گیا۔ اب وہ حیران تھا کہ فوجی کا نشانہ چوک کیوں جاتے سامنے بڑے بڑے محرکے سر کئے تھے۔ وہ برما کے محاذ پر لڑتا رہا۔ اس نے جاپانیوں کو بھاگتے دیکھا تھا۔ دشمن اس کی گولیوں کی بوچھاڑ سے پناہ مانگتے تھے۔ اسکے خطا نہ ہونے والے نشانوں کی داد چینی سپاہی بھی دیتے تھے۔

چینی سپاہی! کتنے اچھے تھے۔ وہ کس ہمدردی سے پیش آتے تھے اس کے ساتھ۔ ان میں سے ایک اس کا گہرا ساتھی بھی بن گیا تھا۔ اس کا نام تھا کچھ چن من ٹن سا، اب یاد نہیں آتا۔ لیکن اس کی صورت آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ درمیانہ قد، سڈول جسم۔ کتنا ہنس مکھ تھا وہ۔ سبھی چینی بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل تھے۔ معمولی بات پر ہنستے تھے۔ کسی جاپانی کو ہلاک کر کے یہ ہنسی قہقہوں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ جسم کا ہر عضو خوشی کے مارے اچھلنے لگتا تھا۔ ہر ایک چینی سپاہی جاپانی خون کا پیاسا تھا۔ وہ اس قدر جان توڑ کر لڑ رہا تھا جیسے لڑنا اس کی فطرت ہو۔ اور وہ لڑنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہو۔ خلوص، بہادری اور جاں نثاری کا پتلا۔ ایک مرتبہ فضل دین نے چن من سے جو اس کی زبان سمجھ اور بول سکتا تھا کہا تھا "مجھے چینی سپاہیوں کی جنگی اور مستعدی اور کہیں نظر نہیں آتی"۔

"اس کی ایک وجہ ہے" چن نے جواب دیا تھا۔

"کیا تمہیں تنخواہ زیادہ ملتی ہے؟"

"...... تنخواہ نہیں دوست!" چن اس طرح ہنس دیا تھا جس طرح کوئی بزرگ ایک بچے کی بات پر ہنس رہا ہو۔ "چینی سپاہی اپنے دیس کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں"۔

یہ الفاظ فضل دین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ اس کے احساس پر چوٹ لگی۔ رگِ حمیّت پھڑک اٹھی۔ قومی غیرت بیدار ہو گئی۔ اسے اپنے سوال پر ندامت محسوس ہوئی۔ ہم ہندوستانی تنخواہ کے لئے لڑتے ہیں۔ ہم آزاد نہیں ہیں۔ تبھی تو یہ گورے اور کالے کا امتیاز ہے۔ انہیں تنخواہ اچھی ملتی ہے۔ خوراک اور پوشاک اچھی ملتی ہے۔ وہ لڑنے میں اس سے پیچھے رہتے ہیں۔ مگر افسر بنائے جاتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ وہ آزاد ہیں۔

گورے سپاہیوں کا سلوک اور ان کی بہت سی باتیں فضل دین کے ذہن میں کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگیں۔ ان میں اور اس میں کوئی بھی بات مشترک نہیں تھی۔ وہ یوں بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی چیز ہی نہ ہو۔ چیونٹی اور تنکے سے بھی حقیر۔ ایک مرتبہ اسے امریکن سپاہیوں کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ جتنی تنخواہ اسے مہینہ بھر میں ملتی ہے انہوں نے اسی قدر رقم دو دن میں چائے اور کھانے میں اڑا دی تھی۔ ہر وقت بو آئے۔ بو آئے پکارتے تھے۔ کھاتے تھے اور ڈکارتے تھے تبھی تو ان کی گالوں پر سرخی ہے۔ جسم پر گوشت کی موٹی موٹی تہیں چڑھی ہیں، اور وہ؟ —— وہ بھی تو اچھی تنخواہ، اچھی خوراک اور کپڑا مفت۔ ایسی باتیں سن کر فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ اس وقت ان الفاظ کا حسن ایک دم ماند پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھیانک دیو ناچ رہے تھے۔ کیا وہ تنخواہ واقعی اچھی تھی؟ دو دن کی چائے اور ایک ماہ کا خون پسینہ۔ ایک مول ایک تول۔ یہ تقابل کتنا بھیانک تھا۔ وہ

کر دیے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر چینی سپاہی کے الفاظ "تنخواہ نہیں دوست! ہم اپنے دیس کی آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں"۔

اور پھر اس تنخواہ سے بھی کیا بن گیا تھا؟ اس کی اپنی بھوک مٹی تھی نہ گھر والوں کی۔ وہ چالیس روپے مہینہ گھر بھیجتا تھا۔ بوڑھے ماں باپ تین بہنیں اور دو ننھے بھائی۔ کیا بنتا تھا چالیس روپے ہیں۔ لوگوں کی زمینوں میں ہزاروں من غلہ پیدا ہوا۔ اناج کے نرخ بڑھے۔ جن کے پاس زیادہ زمینیں تھیں انہوں نے زیادہ اناج اگایا اور مالدار بن گئے۔ لیکن.... لیکن ان کی زمین؟ زمیندار نے ان کی زمین بہت پہلے ہتھیالی تھی۔ صرف ان ہی کی کیوں، کتنے ہی لوگوں کی زمینیں زمیندار کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ لوگ پتلے ہوتے چلے گئے تھے۔ زمیندار پھولتا چلا گیا تھا۔ ڈیڑھ سو بیگھے میں سے صرف پانچ بیگھے زمین ان کے پاس رہ گئی تھی۔ یہ سب زمین زمیندار کے پاس کیسے چلی گئی؟ آج فضل دین کے دماغ میں یہ سوال آپ ہی آپ اٹھ رہا تھا۔ لیکن پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے پہلے اس مسئلہ پر کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ سوچ نہیں سکتا تھا۔ یہ تو ایک اٹی میٹم تھا دن اور رات کی طرح۔ ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن اب..... اب اس پر ایک حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا۔ اور یہ حقیقت بہت ہی بھیانک تھی۔

وہ چار سال کے بعد گاؤں لوٹا تھا۔ اپنے کئی ساتھی اور اپنے اندر کی بہت سی پرانی باتیں میدان جنگ میں چھوڑ آیا تھا۔ اب وہ فضلا نہیں تھا۔ دو چار بڑے بوڑھوں اور دو ایک لنگوٹیے یاروں کے سوا اسے کوئی فضلا نہیں کہتا تھا۔ سب فضل دین کہتے تھے۔ اس کے لئے گاؤں بدل گیا تھا۔ ماحول بدل گیا تھا۔ اگرچہ کھیت وہی تھے، درخت وہی تھے، انہیں دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا۔ اس نے جنگ سے لوٹنے کے بعد جب پہلے دن ہل کی ہتھی ہاتھ میں لی تھی تو جہاں اس کا پانچ بیگھے کھیت ختم ہوتا ہے وہاں رکنے کو اس کا جی نہیں چاہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لمبی آڑ کھینچے جتنا کھیت وہ جوت سکتا ہے اتنا اس کے پاس ہو۔ لیکن آگے زمیندار کی حد تھی، یہ حد کیوں تھی؟ یہ حد کیا ہے؟ پہلے اس کے کھیت کی حد بہت پرے تھی، یہ سکڑ کر قریب کیوں آگئی؟ اب پھر پھیل کر دور تک جا سکتی ہے۔ اس کی نظر میں حدود کا تصور مٹ چکا تھا۔

پہلے وہ اپنے کھیت پر سخت محنت کرتا تھا۔ اناج پیدا ہو نہ ہو ہر فصل کا لگان چکاتا تھا۔ یہ بھی نہیں سوچتا تھا کہ یہ لگان کیوں لیا جاتا ہے؟ اور کہاں جاتا ہے؟ اسے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ محنت کرنا اور پیٹ بھرنا اس کا کام تھا۔ اپنے کھیت سے گذارہ نہ ہوتے دیکھ کر وہ دوسروں کی چاکری کرتا تھا۔ جو کچھ ملجاتا تھا اسی پر اکتفا کرتا تھا۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر صبر کر لیتا تھا۔ لیکن اب ــــ اب اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ قسمت کو بھی نگل سکتی ہے۔ صبر کا لفظ زندگی سے خارج ہو چکا ہے۔ اسے اپنا حصہ چاہیئے، حق چاہیئے۔ وہ جتنا بھی اس بات پر سوچتا ہے اس کی بھوک زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خلا بڑھ رہا ہے۔ اس خلاء کو پر کرنے کے لئے زبردست آندھی ــــ زبردست طوفان درکار ہے۔

ہوائی جہازوں کی گونج، توپوں کی دھائیں دھائیں اور بموں کے دھماکوں نے اس کے دل کا سکون چھین لیا۔ جمود کی موٹی تہ کو توڑ دیا ہے۔ اس کے اندر ہل چل مچی ہے۔ اضطراب ہے بے چینی ہے۔ روز بروز تلخیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میدانِ جنگ میں اسے صرف غیروں سے گلہ تھا۔ گوروں سے امتیازی سلوک کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ امریکن سپاہیوں کو تنخواہ زیادہ کیوں ملتی تھی۔ لیکن جب جنگ سے لوٹ کر آیا تو اسے اپنوں سے بھی گلہ پیدا ہو گیا۔ گاؤں کے ذیلدار کا لڑکا عبدالشکور اس کے ساتھ ہی جنگ میں بھرتی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی لڑتا مارا رہا اور اس کے ساتھ ہی لوٹ کر آیا۔ ان دونوں کے کاغذوں پر لکھا تھا کہ انہیں دوسری جگہ کام مل جائے گا۔ اور ڈسچارج کرنیوالے افسر نے کام دلانے والے دفتر کا پتہ بھی بتایا تھا۔ وہ سڑکوں کی خاک چھان کر دفتر کے افسر سے لڑ جھگڑ کر چلا آیا تھا۔ کسی نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔ لیکن عبدالشکور پولیس میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کچھ دنوں میں تھانیدار بنجائے گا۔ وہ لڑنے میں اس سے اچھا نہیں تھا جسم اور صحت میں بھی اچھا نہیں تھا۔ پھر اس کے ساتھ رعایت کیوں؟ وہ ذیلدار کا لڑکا ہے۔ انہیں افسروں تک رسائی حاصل ہے۔ اس کے لئے بڑے وزیر کی سفارش حاصل کی گئی۔ یہ وزیر اور ذیلدار اسکی راہ کے کانٹے ہیں۔ ورنہ شکور جیسا مریل آدمی اس کے مقابلہ میں ہیڈ کنسٹیبل کیسے بن جاتا۔

اور وہ یہیں بیٹھا ہے۔ اپنے کھیت میں جس کی حدود اس قدر تنگ ہو گئی ہیں کہ اس کی ہستی کا پھیلاؤ اس کے اندر کا خلا اب اس میں سما نہیں سکتا۔ اس میں اتنا اناج پیدا نہیں ہوتا کہ اس کا اور اس کے کنبے کی گذران ہو سکے۔ کیا یہ سکڑی ہوئی حدیں پھر سے پھیل نہیں سکتیں؟ اس کی نگاہیں شیشم کے ایک بڑے درخت پر جا کر اٹک گئیں۔ یہ درخت بہت پرانا تھا۔ شاید اس کے دادا نے لگایا تھا۔ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی تھیں۔ ٹہنیوں کو خوراک خاطر خواہ نہیں پہنچتی تھی۔ اس نے جنگ سے لوٹ کر باپ سے کہا تھا کہ اب اسے کٹوا دیا جائے تو لکڑی کام میں آئے گی اور اس کی جگہ دوسرا درخت لگ سکے گا۔ لیکن باپ کو اس درخت سے پیار تھا۔ اس نے اس کے ٹھنڈے سائے میں جوانی کے دن گذارے تھے۔ اس لئے کہہ دیا "نہ رہنے دو بیٹا۔ بزرگوں کی یادگار ہے۔ کبھی آپ ہی گر جائیگا۔"

اس کے قریب ایک دوسرا درخت تھا۔ جب وہ جنگ میں بھرتی ہو کر گیا تو وہ ابھی پودا ہی تھا۔ لیکن اب وہ اچھا خاصا درخت بن گیا تھا۔ اس کی شاخیں پورب، پچھم، اتر، دکن ہر طرف پھیل گئی تھیں۔ اس کی پتلی پتلی ٹہنیوں پر نرم و نازک ہرے ہرے پتے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ فضل دین اس درخت کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور چہرہ ایک نوزاد کونپل کی طرح ملائم ہو گیا۔ جیسے وہ کوئی اچھوتی اور بڑی بات سوچ رہا ہو۔ ہاں وہ سوچ رہا تھا "اسے ابھی اور بڑھنا ہے۔ اور پھیلنا ہے۔ تناور درخت بننا ہے۔"

اس خیال اور اس کی اپنی شخصیت میں ایک چیز ہم آہنگ تھی۔ ورنہ ایک انسان ایک درخت کے ارتقا پر اس قدر خوش کبھی نہیں ہو سکتا۔ ارتقا کی عظمت اس کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اور یہی عظمت اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کا موجب تھی۔

ہاں اس کی اپنی شخصیت میں بہت سی شاخیں پھوٹی تھیں۔ جو پورب، پچھم اور اتر کو پھیل رہی تھیں۔ اب وہ برطانیہ، امریکہ، روس جرمنی اور جاپان بہت سے ملکوں سے واقف تھا۔ میدان جنگ میں ان کی قسمت کو بنتے بگڑتے دیکھ چکا تھا۔ بہت سے لوگوں سے ملا تھا۔ ان کے نفرت اور پیار کو دیکھا تھا۔ اس کا چینی دوست چن من اس کے تصور میں مسکرا اٹھتا تھا۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ اس کا ملک بہت لمبا چوڑا ہے۔ وہاں پچاس کروڑ انسان بستے ہیں۔ یہ جنگ ان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس دیس کے بہت سے حصے پر جاپانیوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ وہ اپنا ملک ان سے واپس لیں گے۔ ان کو وہاں سے مار بھگائیں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے جاپانیوں کو مار بھگایا تھا۔

پھر اس کا اپنا دیس بھی تو گاؤں تک محدود نہیں۔ وہ بھی تو بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس میں کتنے میدان ہیں۔ کتنی ندیاں اور کتنے پہاڑ ہیں۔ وہ اس کی سرحدوں کو پار کر کے برما میں گیا تھا۔ پھر اس نے سنا تھا کہ کبھی برما بھی اس دیس کا حصہ تھا۔ اور یہ سرحدیں برما سے پرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز نے ان سرحدوں کو تنگ کر دیا ہے۔ اور الگ الگ کر کے دونوں دیسوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔

فضل دین کو سرحدوں کی تقسیم اور قبضے سے نفرت تھی۔ جرمنی اور جاپان نے دوسرے دیسوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس لئے تو یہ جنگ لڑی گئی تھی۔ پھر اس کے دیس پر انگریز کا قبضہ کیوں ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ملک کی جماعتیں کانگرس اور لیگ اس قبضے کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ اور انگریز نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد یہ قبضہ اٹھ جائیگا۔ ہمارا دیس ہمیں مل جائے گا۔ ہم آزاد ہوں گے۔ چین کے لوگ جاپان کی شکست پر اپنی آزادی پر کتنا خوش ہوئے تھے۔ جنگ نے اسے اور خواہ کچھ نہ دیا ہو لیکن یہ لفظ ـــــ یہ آزادی کا خیال ضرور دیا تھا۔ وہ اپنے دیس کی آزادی کے لئے جان تک لڑا دینے کو تیار تھا۔

اس آزادی کی فکر میں وہ ہر روز زمیندار کے لڑکے سے خبریں سن کر آتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ شہر سے اخبار منگواتا تھا اور آزادی سے متعلق بہت سی باتیں سنایا کرتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ انگریزوں نے ہماری آزادی تسلیم کر لی ہے۔ اور تین وزیر برطانیہ سے چل کر ہندوستان آئے ہیں تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ وہ آزادی کس ڈھنگ سے اور کن لوگوں کے سپرد کی جائے۔ وہ وزیر تین مہینے ہندوستان میں رہے۔ کبھی دہلی اور کبھی شملہ میں میٹنگیں کرتے رہے۔ فضل دین

ان کے متعلق سب خبریں شوق سے سنتا رہا۔ جب اسے معلوم ہوا تھا کہ ہمارے لیڈر آپس میں سمجھوتہ نہیں کرتے اس لئے دیر ہو رہی ہے تو اسے بڑا غصہ آیا تھا۔ آخر امید بندھ گئی تھی۔ زمیندار کے لڑکے نے بتایا تھا کہ آزادی کا مسئلہ طے ہوگیا۔ اب لیگ کی حکومت بنے گی لیکن ایک دن سارا کھیل ختم ہوگیا۔ اخبار والوں نے ان وزیروں کی تصویر بنا کر ان کا مذاق اڑایا تھا۔ ان کے سامنے ایک پٹاری رکھی تھی۔ اور ادھر اُدھر دو چار غیر ضروری چیزیں بکھری پڑی تھیں اور نیچے لکھا تھا

ع تماشا دکھا کر مداری گئے

"تو یہ سب دھوکا ہی تھا؟" فضل دین نے زمیندار کے لڑکے سے دریافت کیا۔

"دھوکا نہیں تو اور کیا تھا؟"

فضل دین کا دل تلخی سے بھر گیا۔ خیالات کی رو ایک دم رک گئی اس کی نظر پھر اس مٹی کی ڈلی پر جا رکی۔ جس پر زندہ چیز ہونے کا دھوکا ہوتا تھا۔ اب ایک کنکر بھی اس ڈلی کے قریب پڑا تھا۔ یہ اس نے پھینکا تھا۔ مگر اس کا نشانہ چوک گیا تھا۔ لیکن فوجی کا نشانہ چوک کیوں جائے۔ اسے تعجب ہوا اور کسی قدر تکلیف بھی۔ اس نے ایک اور کنکر اٹھایا اور تاک کر اس ڈلی پر مارا۔ نشانہ درست بیٹھا۔

اور وہ ڈلی حرکت میں آ گئی۔ ایک کنکر کی چوٹ سے ڈلی حرکت میں آ گئی۔ وہ چل رہی تھی۔ فضل دین کے اندر ہل چل پیدا ہوئی۔ جیسے اس کے اپنے اندر کوئی چیز تیزی سے چل رہی ہو۔ دراصل وہ مٹی کی ڈلی نہیں تھی۔ گوبریلا تھا۔ ویسے ہی سست پڑا تھا اور اب چل رہا تھا۔ اس کی روح بیدار ہو چکی تھی۔

اچانک پورب سے زبردست بگولا بڑھتا ہوا آیا اور شیشم کے پرانے درخت سے ٹکرا گیا۔ چٹاخ تڑاخ! جیسے اسکے ٹہنے ٹوٹ رہے ہوں۔ جیسے وہ جڑوں سے اکھڑ جائیگا۔

فضل دین کو اپنے اندر ایک طوفان سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ طوفان بڑھ رہا تھا۔ خلا پر ہو رہا تھا۔ اس نے بہت سے کنکر مٹھی میں لے کر جس سمت بگولا جا رہا تھا اس سمت کو پھینکے اور زور سے کہا "ہُرّا!"

اس وقت گاؤں سے شور بلند ہوا۔ جیسے گاؤں کی سوئی ہوئی روح جاگ اٹھی ہو۔ جیسے آزادی کا بگل بج رہا ہو۔ جیسے سب لوگ ایک عظیم کوشش میں لگے ہوں اور بلند آواز سے کہہ رہے ہوں: "ہم اپنے دیس کے لئے لڑ رہے ہیں۔"

(حلقہ ارباب ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

بقیہ صفحہ نمبر ۳۵

(تماشا از یزدانی ملک)

چھرے کی طرف جاتی تھی۔ جمداری شاید غلطی سے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اور سفید ٹوپی والا اس چھوٹے سے کھلونے کو دیکھ دیکھ کر کتنا خوش ہو رہا تھا۔ جمداری جاتے ہوئے اسے دے گیا تھا اور جس کے ساتھ ان دونوں کی گردن کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ بندریا کا بیاہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اب وہ اپنے بوسیدہ لہنگے کو ٹٹولنے میں مصروف تھی۔ جو اس کھینچا تانی میں کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ اب اپنے جسم کے رِستے ہوئے ناسوروں پر بھی غور کر رہی تھی جن کا اندمال جانے کیسے ممکن تھا۔

(حلقہ ارباب ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

کرتار سنگھ دُگل

پنہدا خاں

پنہدا خاں بہت دیر تک اس بار اپنے مکان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا تھا۔ کنوئیں پر شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے اس کی آنکھ لگ گئی۔ رہٹ میں جُتا ہوا بیل اس کے خراٹوں کی آواز سن رہا تھا۔ ریں ریں، ٹھک ٹھک" کنواں چلتا رہا۔ سوتے میں پنہدا خاں کا ہاتھ اس کے کشادہ سینے پر آ گیا تھا۔ ہوا کی تیزی کے ساتھ ساتھ تارا میرا کے تیل سے چکناتے ہوئے پنہدا خاں کے بال مٹی سے اٹے جا رہے تھے۔ پیلا ہی کے سوکھے چھلکے کی طرح اس کی ایڑیاں کھردری اور پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے بھرے بھرے بازوؤں پر لڑکیوں کی وہ تصویریں جو میلوں میں اس نے کھدوائی تھیں عجب درجے دکھا رہی تھیں۔

پنہدا خاں نے خواب میں دیکھا کہ پانچ شخص گھوڑوں پر سوار دندناتے ہوئے اس کے لیارہ میں آ گھسے ہیں

"مانگ پنہدا خاں، کیا مانگتا ہے جو تیرے جی میں آئے مانگ۔ تیرے کنوئیں کا پانی غضب کا ٹھنڈا ہے۔ خدا کے بندوں کو ایسا ہی پانی پلایا کر۔ بول بھی، بولتا کیوں نہیں پنہدا خاں!"

پنہدا خاں گھبرا سا گیا "کیا مانگوں"۔ اپنے دل سے پوچھا۔ "اللہ اللہ مال اور تو سب طرح سے اللہ کا فضل ہے۔ صرف ایک لڑکا ہی نہیں ہے۔ دیکھو نا! نشانی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا تو کچھ اعتبار نہیں!"

پہلا سوار۔ اچھا تمہارے لئے ایک بیٹا!

دوسرا سوار۔ نہیں دو!

تیسرا سوار۔ نہیں تین!

چوتھا سوار۔ نہیں چار!

پانچواں سوار۔ نہیں پانچ!

"اچھا ایک اور بات"۔ پنہدا خاں خوش ہو کر بولا۔ "میرے سفید بیل کا پاؤں کچھ خراب سا ہے۔ اگر وہ.... اگر او ہو کہاں جا رہے ہو۔ او ہو"۔

سوار غائب ہو گئے!

پنہدا خاں نے کروٹ لی۔ شرفو دائی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے ہلتا دیکھ کر جگانے کا حوصلہ کیا۔

"چوہدری پنہدا خاں، چوہدری پنہدا۔ اٹھو، جیتے رہو!"

"کیا ہے اماں شرفو!" دائی کی آواز سن کر پنہدا خاں جھٹ اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ ملتے ہوئے "قسمت کی بات ہے، بیٹا! آگئی پانچویں بھی"

پنہدا خاں جھنجلا سا گیا۔ لیکن جھٹ پٹ اپنے آپ کو سنبھالا چارپائی سے اٹھ کر شہتوت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا "کیا ہے، اماں شرفو! بیٹیاں اپنے نصیب ساتھ لایا کرتی ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں!"

زمیندار کا جواب سن کر دائی کو حوصلہ سا ہو گیا۔ اور وہ ایک پرانی پگڈنڈی پر گاؤں کی طرف چل دی۔

پنہدا خاں بہت دیر تک شہتوت کے تنے سے لگا ویسا ہی کھڑا رہا آخر جس ٹہنی پر اس نے ہاتھ رکھا تھا ٹوٹ کر نیچے آ رہی۔ "لعنت"۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی غصہ میں کہا۔ اور رہٹ میں جُتے ہوئے بیل کو کھول کر چرانے کے لئے لے گیا۔

پنہدا خاں سارا دن کیکر کی چھاؤں میں بیٹھا فکر میں ڈوبا رہا۔ اگر کسی ڈھور کو ایک سے دوسری دفعہ موڑنا پڑتا تو وہ جھنجلا اٹھتا۔ دوپہر کے وقت جب وہ مویشیوں کو پانی پلا کر لایا تو اس کے سب اعضا تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ بیٹھے ہوئے بوریئے میں سے آج اسے کیکر، بجکرا اور مولی کے کانٹے بھی بار بار چبھتے۔ چھوٹے چھوٹے کنکروں سے ٹھوکریں کھاتا وہ۔ سارا دن بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ آج اس نے چھاچھ منگوائی تھی نہ کھانا کھانے کو گھر لوٹا تھا۔ جھاڑیوں میں لگے ہوئے سُرخ سُرخ بیر جو وہ جھولیاں بھر بھر کر کھایا کرتا تھا، آج وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا

تھا۔ شفاف چشمے کی طرح بہتی آنکھ پر وہ کئی چکر لگا آیا تھا لیکن اس نے پانی کا ایک چلو بھی نہ پیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس پر دھوپ آگئی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ لاکھی بچھیا بڑی نٹ کھٹ تھی کبھی اس کھیت میں آپڑتی۔ کبھی دوسری طرف جا نکلتی۔ پنہدا خاں بڑا غضبناک ہوتا۔ "اری تک بھی جا۔ کیوں موت کو پکارتی ہے۔" وہ لٹھ سنبھال کر اٹھا لیکن پھر رکھ دی اور بیٹھ گیا۔

اپنے بہت سے دوستوں سے پنہدا خاں نے لڈوؤں کے وعدے کئے تھے۔ بہت مدت سے اس نے ایک بکرے کی نذر دینی بھی ٹھان رکھی تھی۔ بلکہ پچھلی جمعرات کو وہ ساہوکار سے ایک بوری شکر بھی لینے کے لئے بھی کہ آیا تھا۔ کئی سالوں سے وہ سارا کام تنہا سنبھال رہا تھا۔ "اپنا بیٹا ہوگا تو باپ کا ہاتھ بٹائے گا۔" وہ دل ہی دل میں سوچتا تھا۔ اس کے جی میں بڑی بڑی حسرتیں تھیں لیکن سب وہیں دفن ہوگئیں!

اُن ملاحوں کی طرح جو اپنی ناؤ ڈبو چکے ہوں، شام کو پنہدا خاں گھر لوٹا۔ صحن میں مکمل خاموشی تھی۔ اس کی بڑھیا ماں غم میں ڈوبی سر جھکائے چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ بڑوں کو غمگین دیکھ بچے بھی منہ بسورے بیٹھے تھے۔

"شلو" اس کی بڑی لڑکی تو سارا دن روتی رہی۔ ایک ننھا سا بھائی کھلانے کو اس کا جی کتنا چاہتا تھا۔ بہنیں، بہنیں، بہنیں۔ اسے زہر لگتی تھیں۔ ڈنگر ڈھور کو پنہدا خاں نے تھان پر باندھا! "یا اللہ" کہتے ہوئے درانتی لی اور گھاس کھودنے کے لئے باہر چلا گیا۔ آج گھاس کھودتے کھودتے پنہدا خاں کو بڑی دیر ہوگئی۔ ہاتھ ادھر مارتا لیکن ادھر جاتا۔ وہ ایک بار تو اس نے اپنی انگلی بھی زخمی کر لی تھی۔ آسمان میں جھلمل کرتے تارے دیکھ کر اسے "چناں دے تیری جانتی" کا آج خیال ہی نہ آیا۔ لوٹتے ہوئے جب وہ رہٹ کو ایک چکر دے کر چلّو سے ٹھنڈا پانی پینے لگا تو اسے اپنا سینا یاد آگیا۔ پانی بوند بوند ٹپک کر بہ گیا۔ وہ سوچتا رہا سوچتا رہا اور پیاسا ہی گھر لوٹ آیا۔

"ذرا اندر جاؤ تو۔ ایک دفعہ نورنشاں سے مل تو آؤ" بوڑھی ماں نے بیٹے سے کان میں کہا۔ لیکن پنہدا خاں نے ٹال دیا۔

"دیکھو نا بیٹا! سارا دن بیچاری چھاجوں روتی رہی ہے۔" ماں نے اسے پھر کہا۔

آخر وہ اندر گیا!

دالان میں سب سے اندھیرے کونے میں نورنشاں بان کی چارپائی پر پڑی تھی۔ اس کے سرہانے ایک سرسوں کے تیل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں لال؛ ورانس کا چہرہ نچڑے ہوئے لیموں کی طرح ہوگیا تھا۔ "اری او حرام کی بچی! آخر بیٹی ہی جنی۔" پنہدا خاں تو اتنی سی بات کہہ کر باہر چلا گیا۔ لیکن جس طرح رہٹ کو ایک چکر دینے سے پانی دیر تک ٹپکتا رہتا ہے۔ نورنشاں ساری رات روتی رہی۔ اس نے نومولود کی طرف پہلو بدل کر دیکھا نہ اسے دودھ پلایا۔

وقت گزرتا گیا۔ نورنشاں کی چھاتیاں بوجھل ہوتیں تو وہ گھوٹو کو دودھ پلا دیتی۔ ورنہ سارا سارا دن وہ ننھی جان چلاتی رہتی کوئی اس کی بات تک نہ پوچھتا۔ آنکھیں دکھنے آئیں تو آپ سے آپ ہی اچھی ہوگئیں۔ کسی نے چاکسو کی ایک سلائی تک نہ ڈالی۔ مٹی میں پڑی ہوتی تو وہیں کھیلتے کھیلتے سو جاتی ماں پروا تک نہ کرتی۔ اس کی بڑی بہن کی اترن اسے پہنا دی جاتی۔ نئے کپڑے کا ٹکڑا تک بھی اس کو نہ نصیب ہوا مگر گھوٹو تھی کہ بڑھتی ہی گئی۔ بڑھتی ہی گئی!

جس دن سے گھوٹو آئی پنہدا خاں کا ستارہ ڈھلتا گیا۔ پہلے تو اس کے بیلوں کے لاکھے جوڑ کو موت نے آلیا۔ بیچارے کو بڑا صدمہ ہوا۔ بیلوں کے ابھرے ہوئے پیٹ پر بار بار گرتا اور روتا روتا بیحال ہو جاتا۔ افتاد پر افتاد یہ پڑی کہ اس کی ساری زمین میں کلر اٹھ آیا۔ وہ کتنی ہی محنت کرتا۔ مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ ساون کی جھڑیوں میں اس کا مویشیوں کا کوٹھا بیٹھ گیا۔ کنوئیں کی ماہل ٹوٹ گئی۔

سات سال گزر گئے مفلسی اور مصیبتوں کی کالی آندھیاں پنہدا خاں کے سر پر سے گذریں، لیکن نورنشاں کو اس نے منہ تک نہ لگایا۔ بڑے بڑے جھگڑے کھڑے ہوئے، عرصہ تک وہ میکہ میں رہی، پنچوں نے فیصلے کئے لیکن وہ ایک ہی بات کہتا کہ میرے ہاں جو منگ مرچ سے کھائے۔ لیکن اسے بلانے کو جی میرا نہیں چاہتا۔ کئی دفعہ سوتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے وہ پانچ سوا آجاتے۔ پنہدا خاں انکو گھور گھور کر دیکھتا اور سخت غضبناک ہو کر بار بار دانت پیستا۔ اسی حالت میں اپنے بیٹے کو اندر ہی اندر جلتا اور روز بروز کمزور ہوتا دیکھتی اور عمر بھر ایک

پوتے کو ترستی اس کی بوڑھی ماں چل بسی۔ لڑکیاں تھیں کہ عشق پیچاں کی بیل کی طرح دنوں میں پھیلتی جاتی تھیں۔ گھٹو سے قطع نظر باقی چاروں کی جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ پنہدا خاں کے پاس اب پھوٹی کوڑی تک نہ تھی کہ انکا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دے سکے۔ آخر شلو اس کی بڑی لڑکی کھل کھیلی۔ ایک بار جب پنہدا خاں باہر سفر پر گیا ہوا تھا۔ وہ میراثیوں کے ایک لڑکے کیساتھ بھاگ گئی۔ راجپوت خاندان کا نام لیوا پنہدا خاں بہت منتشر ہوا۔ مدتوں تک باہر نہ نکلا۔ آخر چوٹ سہ گیا۔

پنہدا خاں نے بہت کوشش کی کہ باقی لڑکیوں کی کہیں آگے پیچھے کر دے' لیکن برادری میں سے کسی نے اس کی مدد نہ کی گئی رشتہ داروں کے پاؤں پہ اس نے اپنی پگڑی رکھدی۔ لیکن کسی نے ہاں نہ کہی۔ رنج اور غم سے بھرا ہوا وہ گھر بیٹھ رہا۔ اچانک ایک دن شام کے قریب سر پر ایک پھٹا سا چیتھڑا اوڑھے "شلو" گھر آگئی۔ پنہدا خاں غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ لیکن بات ٹالکر ایک پھٹی ہوئی جھول کو ٹانکنے لگا۔ اس نے شلو کو بلایا نہ اس کی واردات پوچھی۔ برادری میں پھر شور ہوا کہ پنہدا خاں نے ایسی لڑکی کو پھر گھر میں داخل کرلیا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ ایک تلخ گھونٹ کی طرح جیسے پی ہی گیا۔

مفلسی سارے خاندان کو ستا ستا کر مار رہی تھی۔ فاقوں پر فاقے آتے۔ لیکن پنہدا خاں کبھی شکوہ نہ کرتا۔ خدا کے آگے جھولی پھیلاتا نہ پڑوسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتا۔ ایک دن شام کو گھر لوٹا۔ عجیب چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا گھٹو کے ماتھے سے خون کا چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا اس کی بڑی بہن نے اس کے پتھر دے مارا تھا۔ مارے غصہ کے اس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ لیکن وہ پھر بات ٹال کر کھیتوں کو نکل گیا۔ بہت دیر تک پنہدا خاں کنوئیں پر شہتوت کے تلے سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔ کھڑے کھڑے جھٹ پٹا سا ہو گیا۔ اور مسجد سے اسے مغرب کی نماز کی اذان سنائی دی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ لیکن بادل کے سفید سفید ٹکڑوں میں رحم کے آثار نہ تھے کہ وہ اس کے دکھ کو دیکھ سکتے۔ وہ گھر لوٹنے ہی کو تھا کہ سامنے کے کھیت کے سرے پر اسے سرکنڈے ہلتے نظر آئے۔ وہ وہیں جم گیا۔ اس نے دیکھا شانو اس کی شلو سے چھوٹی لڑکی دبے پاؤں کھیت سے نکل کر باڑ پھلانگ کر گھر کو چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا جہاناں موچی وہیں سے نکل کر گاؤں کیجانب چلا گیا۔ پنہدا خاں گھر آکر بغیر کچھ کھائے پیئے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

آدھی رات کو جب سب سو گئے وہ آہستہ سے اٹھا۔ پچھلے صحن کے ایک کونے میں گھٹو سو رہی تھی۔ وہ اسکے پاس گیا۔ معصوم پر نظر ڈالکر وہ ذرا ٹھہر گیا۔ آسمان کی طرف دیکھا تارے ہنس رہے تھے۔ چاند آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی اس نے بچی کو اٹھالیا۔ ایکدفعہ اللہ کہا۔ گھٹو اس کے شانہ کیسا لگ کر پھر سو گئی۔ پنہدا خاں باہر نکل گیا۔ کنوئیں پر پہنچ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں! اور کندھے سے لگے ہوئے بوجھ کو چھوڑ دیا۔ دھڑام کی آواز آئی۔ اس نے چاروں طرف سے دیکھا۔ پتہ تک نہ ہلتا تھا۔ وہ گھر لوٹا۔ دوسری لڑکی کو اٹھایا۔ "شانو گما تو کیوں چلایا کرتی ہو" لڑکی بڑبڑائی۔ پنہدا خاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کنوئیں سے پھر دھڑام کی آواز آئی۔ قدرت چپ تھی۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ وہ تیسری لڑکی کو اٹھا کر لایا۔ شہتوت کے پاس کھڑا ہو کر اس نے سرکنڈوں کی طرف دیکھا۔ ان میں کوئی جنبش نہ تھی۔ ایک بار پھر دھڑام کی آواز آئی۔ اس مرتبہ آواز ذرا دھیمی تھی۔ گویا کنواں بھر گیا ہو۔ شہتوت پر سویا ہوا فاختہ کا جوڑا اب جاگ چکا تھا۔ پنہدا خاں دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں پھر ایک ٹہنی پر سو گئے۔

اب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سرکنڈوں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ پنہدا خاں کو نہ بھائی۔ وہ پھر گھر چلا گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد کنوئیں کی طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے لت پت ایک ٹکڑا تھا۔ شہتوت کے نیچے کھڑا ہو کر اس نے انگڑائی سی لی۔ معلوم ہوتا تھا، کہ مدت کے بعد آج پنہدا خاں نے اپنے تئیں ہلکا محسوس کیا۔ ٹکڑے کو کندھے پر رکھ کر وہ وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔ چاند کی چاندنی شہتوت کے پتوں سے چھن چھن کر پنہدا خاں پر گر رہی تھی۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

یزدانی ملک

تماشا

ڈگڈگی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اور محلے والے اس آواز کی طرف گویا کھنچے چلے جا رہے تھے۔ بچے بوڑھے۔ مرد۔ عورت سبھی ہمہ تن گوش بنے اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس آواز میں وہ کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ کچھ پا رہے تھے۔ اپنا کچھ کھویا ہؤا۔ کچھ لُٹا ہؤا۔ سب کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ ایسے ہی جیسے کوئی دیر سے بچھڑا ہؤا ساتھی مل جائے۔ مکانوں کی چھتیں۔ دکانوں کے چبوترے۔ کھڑکیاں۔ دروازے۔ اور درختوں کی شاخیں تک لوگوں سے بھری پڑی تھیں۔ تمام لوگ مشتاق نگاہوں سے ڈگڈگی کی آواز آنے والی سمت نظریں جمائے مداری کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ سب کو اب کے مداری سے کوئی نیا کھیل دیکھنے کی اُمید تھی۔ پرانا کھیل دیکھ دیکھ کر تو وہ تنگ آ چکے تھے۔ وہی ایک بندر اور بندریا کا فرسودہ سا کھیل۔ دونوں کی شادی۔ اور پھر ناراضی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مداری بھی یہ کھیل دکھا دکھا کر اکتا چکا تھا۔ اب کے وہ ضرور کوئی نیا کھیل لائے گا۔ بالکل نیا۔ اور نئے کھیل کی بہت دھوم تھی۔ دور دور سے لوگ یہ کھیل دیکھنے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ اب مداری آ پہنچا تھا۔ ہر طرف تالیوں۔ سیٹیوں اور نعروں سے اک ہنگامہ سا بپا ہو گیا تھا۔ بچوں نے تو خوب ہی اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ بس پھولے ہی نہ سماتے تھے۔ واقعی مداری اب کے کوئی نیا کھیل لایا تھا۔ اب کے اس کے ہاتھ میں بجائے ایک بندر کے دو بندروں کی رسیاں تھیں۔ اور ایک بندریا بھی تھی وہی پرانی۔ لیکن بندروں نے اب کے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک نے سیاہ اور دوسرے نے سفید۔ مداری کے ساتھ اب کے اس کے کچھ ساتھی بھی تھے۔ مداری تو خیر پرانا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی سب کے سب نئے اور نہایت ہوشیار نظر آتے تھے۔ لوگوں کے جوش و خروش کا ان پر کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہی بوڑھے بندروں کی طرح کبھی ایک کو دانت دکھاتے اور کبھی دوسرے کو۔ لیکن نہایت اطمینان سے۔ پھر وہ تھے بھی ایک جیسے ہی۔ وہی گنجا سر۔ چمکتی ہوئی چندیا۔ گول مول سے چہرے۔ اور ایک ہی طرح کا لباس۔ مداری کی ایک آنکھ شاید مصنوعی تھی۔ کیونکہ اپنے ساتھیوں کی طرف وہ جب بھی دیکھتا۔ تو اسے اپنا پورا چہرہ ان کی طرف گھمانا پڑتا۔ جو لوگ مداری کے آنے سے پہلے اسے اور اس کے کھیل کو شک و شبہ سے دیکھ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔ کہ اب کے بھی وہی کھیل ہوگا۔ فرسودہ سا۔ اور خواہ مخواہ بیٹھنے کی کوفت ہوگی۔ وہ بھی اب کچھ مطمئن سے نظر آتے تھے۔ ان کا شک و شبہ بھی اس شور و غل میں شاید ہوا ہو گیا تھا۔ آخر تماشا شروع ہؤا۔ عنقریب ہی بندریا کا بیاہ ہونے والا تھا۔ اور مداری ان دونوں بندروں کو دعوت دے رہا تھا۔ پیار سے چمکار سے۔ ان کی پیٹھ تھپک کر۔ بندریا کی جوانی کا واسطہ دے کر۔ لیکن بندر تھے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور بس۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کہتا ہو۔ کہ آگے نا پہلے۔ بولو۔ جواب دو۔ اور دوسرا جیسے کہتا ہو۔ کہ تم کیوں نہیں بولتے۔ پہلے تو اتنا شور بپا کر رکھا تھا۔ اور اب جیسے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہوں۔ نہ جانے اوپر درخت پر ایک لمبی داڑھی والا بندر کہاں سے آ گیا تھا وہ ہاتھ میں ایک لمبی تلوار لئے اس کی چمک سے مداری اور ان بندروں کی آنکھیں خیرہ کئے دیتا تھا۔ اور اس کی خونی آنکھیں جیسے مداری کو کہہ رہی ہوں۔ کہ ایسا دھوکا۔ اس قدر فریب۔ ایسی طوطا چشمی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں کی بات ہے۔ جب تمہاری ان سفید اور زرد مداریوں سے ٹھن گئی تھی۔ اور وہ تمہارے سدھائے ہوئے بندروں پر چھاپا مارنا چاہتے تھے۔ تمہارا ملک غصب کر لینا چاہتے تھے۔ تمہیں بھوکوں مارنا چاہتے تھے۔ بلکہ دنیا سے تمہارا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے تھے۔ اس ہنگامے کی یاد سے اب تک تمہارے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم تمہارے آڑے آئے تھے۔ ایک پوری فوج سے تمہارا ہاتھ بٹایا تھا۔ اور ان سفید اور زرد مداریوں کو مار بھگایا تھا۔ اگرچہ اس جنگ میں ہمارے کتنے ہی بندر کھیت رہے تھے۔ کتنے ہی زخمی ہو گئے تھے ....

.... لیکن ہم نے اپنے خون سے تمہاری خدمت کی۔ تمہیں کھانے کے لئے اپنے درختوں کے پھل دیتے رہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر۔ اگر اس وقت ہم تمہاری مدد نہ کرتے۔ تو تمہیں آج یہ صبح دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اور اس وقت تو تم بھی خوب ہماری پیٹھ ٹھونکتے تھے۔ گلے میں ڈلوانے کیلئے ہم لوہے کے ٹکڑے دیتے تھے لیکن اب بڑو دیری اتنی طوطا چشمی ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ بندریا کا بیاہ اور ہمیں بلاوا تک نہ بھیجا ایک اور طرف دور اونچا بیٹھا ہوا لمبی دُم والا لنگور ان سب کی طرف عجیب بے اعتنائی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے ہاتھ کا پھل اس سب بکواس سے بہتر تھا۔ وہ پھل کھا کھا کر چھلکے ان کی طرف پھینکتا جاتا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بھائی جلدی کرو بندریا کی شادی۔ آخر یہ دیر کیوں ہے کچھ پھل اور مٹھائی تو ہمارے حصہ میں بھی آئے گی نا۔ اور اب کی بار تو کچھ زیادہ ہی ملنی چاہیئے۔ اور نیچے بندر کہاں تو خاموش بیٹھے۔ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اور کہاں اب بندریا کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اس کی دم پکڑنے میں مصروف تھے۔ اب مداری اپنے جوہر دکھا رہا تھا۔ کبھی ایک کی رسی کھینچتا تھا اور کبھی دوسرے کو ڈھیل دے دیتا تھا۔ اور جب کبھی دونو بندر بندریا کے نزدیک پہنچ جاتے۔ تو چپکے سے بندریا کی رسی کھینچ کر اسے غائب کر دیتا۔ اور بندر یہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر بھی کچھ سمجھ نہ پاتے۔ وہ دونو ایک دوسرے کی غلطیاں جوؤں کی طرح نکالتے۔ اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایک دوسرے سے بُری طرح الجھ بھی جاتے۔ ایسے میں کالی ٹوپی والا بندر مداری کے تھیلے میں سے ایک لمبا سا چھُرا نکال لاتا۔ لیکن مداری فوراً اس کی رسی کھینچ کر وہ چھُرا اس سے لے لیتا۔ اور کہتا۔ کہ نہیں بھائی ابھی نہیں۔ صلح اور آشتی سے رہو۔ ایسی خوشی کے موقعہ پر تو تمہیں ناچنا چاہیئے۔ اور سفید ٹوپی والا بندر اس چھرے کی طرف ایسے دیکھتا جیسے کہ رہا ہو۔ کہ یہ مداری ہے بیچ میں۔ ورنہ یہی چھرا تمہارے سینے کے پار کر دیتا۔ ذرا جانے دو اس کو۔ دیکھ لوں گا تمہیں بھی۔ مداری کہہ رہا تھا آخر جھگڑا کیا ہے۔ کیا آفت ہے۔ تم دونو کیوں نہیں آؤ گے بندریا کی شادی پر! وہ آہستہ سے دونو کو سمجھا رہا تھا۔ آخر سفید ٹوپی والا بندر بولا۔ کہ وہ ایک شرط پر آئے گا۔ اور وہ یہ کہ بیاہ پہ بندریا اس کا لایا ہوا جوڑا پہنے۔ سفید۔ سبز۔ اور زرد رنگ کا۔ لہریا سا۔ قوس و قزح کی مانند۔ ہلکا پھلکا۔ بس ایسے ہی جیسے رات کی سیاہی سے دن پھوٹ رہا ہو۔ لیکن سیاہ ٹوپی والے بندر کو بھلا یہ سب کچھ کہاں پسند تھا۔ سفید اور زرد رنگ دونو ہی اس کی نگاہ میں منحوس تھے۔ وہ صرف سبز رنگ کا حامی تھا۔ قدرت کا اپنا رنگ۔ سبز چمکتا ہوا رنگ۔ جو آنکھوں میں کھُب جائے جیسے بہار آتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔ جیسے نئی زندگی پھوٹ رہی ہو۔ مداری نے ایک بار خوب زور سے ڈگڈگی بجائی اور بچوں نے خوب ہی تالیاں پیٹیں۔ کہ یہ دونو اس لے میں شاید کچھ بھول جائیں لیکن نگاہیں ایک دفعہ پھر ان پر جم گئیں۔ کہ یہ آخر کر کیا رہے ہیں۔ مان کیوں نہیں جاتے۔ گھر میں سوت کی ایک تار نہیں۔ اور جلاہے سے پہلے ہی گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ یہ لباس پر جھگڑا کیسا۔ چلو بندریا باری باری دونو کا پہن لے گی لیکن اب ایک اور جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ اس دوران میں شاید انہوں نے کچھ سوچ لیا تھا۔ اس شور و غل نے الٹا ان کے دماغ کو جلا دی تھی۔ بندریا اپنے ناز نخرے سے انہیں متاثر کرنے کی کوشش کرتی۔ اور بعض دفعہ نہایت والعزیبیت آنسو بھی آنکھوں میں لے آتی کہ دیکھو اگر تم شادی پر نہ آؤ گے۔ تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔ کہیں ڈوب مروں گی۔ چوک میں بیٹھ جاؤں گی۔ اور پھر تم بچاتے پھرنا اپنی لاج۔ لیکن ان بندروں نے شاید یہ سب کچھ کھایا پیا ہوا تھا۔ ان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ ایک گھاگ تھے وہ بھی۔ اب وہ مداری سے پوچھ رہے تھے کہ ہم بیاہ پر کتنے کتنے بندر ساتھ لائیں۔ مداری نے انہیں ہی تجویز کرنے کے لئے کہا۔ سیاہ ٹوپی والے نے کہا۔ کہ میں تو پانچ لاؤنگا بشرطیکہ سفید ٹوپی والا بھی پانچ ہی لائے۔ سفید ٹوپی والا فوراً بولا۔ کیوں میں پانچ کیوں لاؤں۔ میں تو

چھ لاؤں گا۔ سیاہ ٹوپی والا بھلا یہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ فوراً بولا۔ کہ اگر تم چھ لاؤ گے۔ تو پھر ہم بھی چھ ہی لائیں گے۔ ہم کیا تم سے کم ہیں۔ ہیٹے ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی جب تماشا ہوا تھا تو تم برابر کے پانچ پانچ ہی مان گئے تھے۔ تو پھر اب چھ کیوں — اب سفید ٹوپی والا کہہ رہا تھا۔ کہ پچھلے سال کی اور بات تھی۔ اس وقت ہمیں اس طرف سے ان سفید اور زرد مداریوں کا خطرہ تھا۔ اور پھر اس مرتبہ میں نے تمہارے کہنے پر اپنے اس بزرگ بھائی کو چھوڑ دیا تھا لیکن اب نہیں چھوڑ سکتا۔ اس بیچارے نے کتنا کام کیا ہے ہمارے لئے۔ کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ ہماری خاطر۔ تم نے تو اسے پہلے ہی برادری سے خارج کر رکھا تھا۔ ہم بھی اس بیچارے کو جگہ نہ دیں۔ اس کے علاوہ یاد ہے۔ وہ ہے چھوٹا سوتیلا بھائی۔ جسے میں نے مداری کے کہنے پر ان پانچ میں شامل نہ کیا تھا۔ کتنی لعن طعن ہوئی تھی مجھ پر۔ سبھی کہتے تھے۔ دیکھو اس بن باپ کے بھائی کو چھوڑ دیا۔ جب غریب تھے تو اس بیچارے نے کتنی خدمت کی۔ کتنا دکھ اٹھایا۔ اور اب بڑے بھائی کو عزت ملی۔ تو اس سوتیلے بھائی کو نکال گھر سے باہر کیا۔ اس کو دہلیز تک چھونے کی اجازت نہیں۔ حیف ہے۔ ایسے بھائی پر۔ تو بتاؤ۔ اب میں اس سوتیلے بھائی کو کیسے چھوڑ دوں۔ تمہارا کیا ہے۔ تم نے تو سب سے ہی بگاڑ رکھی ہے۔ وہ لمبی ڈاڑھی والے بندر سے تمہاری اَن بن ہے۔ نہ سیاہ چھلے والے تمہیں گالیاں دیتے ہیں۔ خبر نہیں تم کیا ہو کہ یہ معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ ہم چھ نہیں بلکہ نو بندر ساتھ لائیں گے۔ پھر وہی جھگڑا ہو گیا۔ بندر ایک دوسرے پر کلکل کرنے لگے۔ اور قریب تھا۔ کہ الجھ پڑیں۔ کہ مداری نے برف منگوا کر ان دونوں کے سر پر رکھی۔ کچھ دیر تک تو برف نے اثر دکھایا اور دونوں بندر ایک دوسرے کے قریب ہو کر ہوش و حواس کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن جلدی ہی برف کا اثر بھی زائل ہو گیا۔ اور پھر وہی دانتا کلکل۔ مداری بھی تنگ آ چکا تھا۔ اس نے ایک اور چال چلی۔ اس نے خود آرام کرنے کے بہانے ان بندروں اور بندریا کی رسیاں اپنے ساتھیوں کے ہاتھ میں دے دیں اور آپ ذرا پرے ہٹ کر سب کچھ دیکھنے لگا۔ مداری کے ساتھی بھی ویسی ہی چالیں چلتے تھے۔ شطرنج کی سی۔ بندروں کو آگے بڑھاتے تھے۔ تو بندریا کی رسی کھینچ لیتے تھے۔ اور بندریا کو بڑھاتے تھے۔ تو بندروں کو آپس میں اُلجھا دیتے تھے۔ کچھ دیر تک خوب تماشا رہا۔ بچے خوش تھے۔ بس ایک ہنگامہ تھا۔ البتہ بندریا بیچاری کا برا حال تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس کا رنگ زرد سے زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں کسی مزار کی محرابوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔ شاید اسے اپنی گزرتی ہوئی جوانی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اب مداری کے ساتھیوں نے بندریا کی شادی پر آنے والوں کی تعداد کو بڑھا کر چودہ کر دیا تھا لیکن سیاہ ٹوپی والا ابھی ناخوش تھا۔ وہ عین بیاہ کے موقع پر ہنگامہ پیدا کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ مداری کے ساتھی کہہ رہے تھے۔ کہ بھائی ان دنوں قحط کا زمانہ ہے۔ اور اس جنگل میں ویسے ہی اب خوراک کم ہوتی جا رہی ہے۔ کئی درخت تو بالکل برباد ہو چکے ہیں۔ پھل دیتے ہی نہیں۔ اس لئے اتنے ہی ساتھی لاؤ۔ جن کی اشد ضرورت ہو۔ بس کام چل جائے۔ لیکن ایسا کہنے سے بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر پہلا مداری ہی پھر آیا اور جانے کی تیاری کرتے ہوئے کہنے لگا۔ کہ یہ بندریا اب جوان ہو گئی ہے اپنا برا بھلا خود سوچ سکتی ہے۔ اور یہ بندر بھی اب سمجھدار اور ہوشیار ہو گئے ہیں۔ ہمیں اب ان سے کیا کام۔ اس لئے ہم اب جاتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس بندریا کی محبت جوش مارے گی تو اسے دیکھنے کے لئے آ جایا کریں گے۔ یا پھر اشیرباد کے لئے بلاؤ گے تو چلے آئیں گے۔ ہمارا کام ختم ہو گیا۔ یہ کہہ کر ہنسی۔ اور اس نے دونوں بندروں کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کو پرے پھینک دیا۔ اب مداری بظاہر جا رہا تھا۔ جاتے ہوئے ایک دفعہ پھر اس نے زور سے ڈگڈگی بجائی۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو یہاں بہت دیر ہو گئی تھی۔ ابھی انہیں اور بھی تو بہت جگہ تماشا دکھانا تھا۔ اس طرف اس ریچھ کا جو بہت موٹا ہو رہا تھا۔ کیونکہ ان دنوں جو کچھ اس کے سامنے آتا تھا۔ وہ اسے نگلتا جاتا تھا۔ شہد، چڑیوں کے گھونسلے اور ان کے انڈے تک نہ چھوڑتا تھا۔ مداری جا چکا تھا۔ اور اس کے ساتھی بھی۔ سیاہ ٹوپی والے بندر کی نگاہ رہ رہ کر اس

(بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

اچھی اچھی کتابیں

داستانِ مجاہد - از نسیم حجازی

یہ ان ماؤں کی داستان ہے جن کی گود میں تاروں پر کمندیں ڈالنے والی قوم بیدار ہوئی - یہ ان نوجوانوں کی داستان ہے جنہوں نے نوکِ شمشیر سے تاریخ اسلام کا ایک روشن باب لکھا اس انداز کے ناولوں میں ایسے دلچسپ ناول بہت کم لکھے گئے ہیں "داستانِ مجاہد" کا ہر نقط موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہے - دوسرا ایڈیشن قیمت مجلد للعہ ر

زندگی - از چودھری افضل حق

زندگی کے نئے مسافروں کے لئے یہ کتاب بہترین رہنما ہو سکتی ہے - عمر رسیدہ احباب کیلئے بھی اس کے بعض ابواب عمر رفتہ کی شیریں یاد یا آئندہ کا ہولناک تصور ہو سکتے ہیں "زندگی" دورِ حاضر کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے - زبان پیاری اور تخیل نہایت ہی بلند - قیمت للعہ ر

سرورِ کائنات - از سید امیر علی - مترجمہ منصور احمد مرحوم

یہ کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے جس کو فاضل مترجم نے ایک بے مثل شاہکار کی صورت میں پیش کیا ہے - اس میں آنحضرتؐ کی زندگی پر ایک انسان کامل کی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کی تعلیم کو ایسے پرجوش اور خوبصورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ موثر پیرایہ آج تک کوئی سیرت نگار نہیں پیدا کر سکا - عہ ر

پنج رنگ ۸؍ ر - سیرت اقبال ۱۲؍ للعہ ر - بزم لطائف عہ ر روایتی افسانے ۸؍ ر - یادگار وارث ۸؍ ر

محمد بن قاسم - از نسیم حجازی

یہ ان کمسن مجاہد کی داستان ہے جس نے سترہ سال کی عمر میں سندھ کو فتح کیا اور اس قوم کی سرگذشت ہے جس کی تاریخ کا ہر صفحہ شہیدوں کے خون سے رنگین ہے - عرب کے ریگزاروں سے ایک آفتاب نمودار ہوا - چمکا اور عین دوپہر کے وقت غروب ہو گیا - "محمد بن قاسم" انوکھے انداز میں تاریخ اسلام کے ان واقعات کا مجموعہ ہے جب عرب کے مجاہد دنیا پر چھا جانے اور دین کو پھیلانے کیلئے جان ہتھیلی پر رکھے تھے - قیمت مجلد صر

سلطان ٹیپو - مرتبہ عبداللہ بٹ

ٹیپو کی موت محض ایک بلند ہمت مجاہد اور شیر دل فرمانروا کی موت نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ حفاظت وطن کا ہر ہنگامہ مر گیا - وہ فولادی بند ٹوٹ گیا - جو برسوں اجنبی اقتدار کے سیلاب کو ملک بھر پر چھا جانے سے روکے رہا - اس آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبردار کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان بھر کے اہل قلم کے مقالات کا مجموعہ قیمت ۸؍ ۱۲ ر

دل کی دھڑکن - از پروفیسر خادم محی الدین ایم اے ٹوی لیٹر -

دوسرے ادبی ڈرامے - پروفیسر صاحب امیچور تحریک کے علمبرداروں میں سے ہیں - آپ نہ صرف ڈراموں کے مصنف ہیں بلکہ انہیں خود پیش کر کے سٹیج کا وہ قابل قدر تجربہ بھی بخوبی حاصل کر چکے ہیں - جس کے بغیر ڈرامہ میں لذت پیدا کرنا بعید دشوار ہے - مختصر ڈراموں کا یہ مجموعہ امیچور ایکٹروں کی جماعتوں میں عموماً اور تعلیم گاہوں کی ڈرامیٹک کلبوں میں خصوصاً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا عہ

بادلوں میں ۸؍ ر - ابوالکلام آزاد ۸؍ ر - شعور ۱۲ ر نصاب زندگی عہ ر جواہرات عہ ر

قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاہور

قریشی صلاح الدین اکبر

جانے سے پہلے

میکارتھی تمہیں معلوم ہے مجھے انگریزوں سے نفرت ہے، میں سیاست میں نہیں الجھ رہا، اس حسین شام کو میں اس آلودگی سے پاک رکھنا چاہتا ہوں، لوگ باہر گلی کوچوں میں چراغاں کا انتظام کر رہے ہوں گے، شام کے دھندلکے میں چراغ روشن آنکھوں کی طرح دمک اٹھیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ دو سو سال کے متواتر میل جول سے سیاسی فرق رہ بھی کہاں جاتا ہے، مگر یہ نفرت! اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ اگر انگریز ہم ہندوستانیوں کے حکمران نہ بھی ہوتے تو میں ان سے نفرت کرتا، مگر تم کس قدر معصوم ہو، تمہیں ذرہ بھر بھی اپنے حسن کا احساس نہیں، یہ تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہوئی پاکیزگی، ادھ کھلی کلی کی پتیوں کی مانند کومل رخسار اور ہونٹوں سے ٹپکتا ہوا شیریں بھولپن، سادگی میں یہ کشش، حسن میں یہ معصومیت میرے اس چھوٹے سے کمرے کی ہر چیز پر تمہارے حسن کا رعب طاری ہو گیا ہے، ہر چیز خاموش ہے، امریکن سگریٹوں کا ہلکا سلیٹی دھواں خاموشی سے اس فضا میں تحلیل ہو رہا ہے۔

اگر تم اس قدر معصوم اور سادہ نہ ہوتیں تو میں تمہاری باتوں کو بھی تمہاری قوم کی Diplomacy سمجھ لیتا، تم کہتی ہو بلکہ تمہیں اعتراض ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے میں نے اپنے کمرے میں سبھاش کی تصویر کیوں لگا رکھی ہے، تمہیں تعجب ہے کوئی انگریز اپنے گھر میں ہٹلر کی تصویر نہیں لگاتا، کوئی فرانسیسی اپنے گھر میں روزویلٹ یا چرچل کی تصویر نہیں ٹانکتا، تم بھی درست ہی کہتی ہو، ممکن ہے تمہارے یہاں ایسا ہی ہو، ہاں مجھے اس طرف کی کسی بات پر یقین نہیں، شاید میں یہ فرض کر لیتا کہ وہ جگہ خدا کی مملکت میں ہی نہیں، کہیں باہر ہے مگر تمہارا ملک بھی وہیں ہے، یہ احساس اسے جھٹلا دیتا ہے، تمہارا ملک حقیقت ہے اور میری باتیں محض خیال ——

لیکن تمہیں ہیڈی لمار (Heddy Lamarr) کی اس تصویر پہ کیوں اعتراض نہیں جو تمہاری کرسی کے سامنے، میری پشت کی طرف دیوار پہ آویزاں ہے، مجھے ہیڈی لمار کی یہ تصویر پسند ہے۔ حالانکہ یہ میرے دیس کی لڑکی نہیں، اس کا انداز بھی میرے ملک کی لڑکیوں کا سا نہیں، میرے ملک کی لڑکیوں کا انداز، تم یہ پوچھ کر کیا کرو گی، آخر تمہیں میرے ملک سے اتنی دلچسپی کیوں ہے، مجھے تو ان باتوں سے ڈر لگتا ہے، جو شخص یہاں آتا ہے اسے اس ملک سے اتنی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ یہاں سے جاتا ہی نہیں، تم لوگوں کو آئے ہوئے بھی دو صدیاں ہو گئیں اور ابھی تمہاری دلچسپی ختم نہیں ہوئی، ہر بدیشی سیاح کو یہاں کے جنگلوں، اژدھوں، سنتوں اور سادھوؤں کی دنیا میں دلچسپی محسوس کرنی ہی چاہیئے۔ لیکن تم دو سو سال سے ابھی تک یہاں جنگلوں، سانپوں اور فقیروں کے علاوہ اور کچھ دیکھ ہی نہیں سکے ——!

تم بھی اس سے متفق ہو، کیوں؟ تمہیں بھی جب تم اپنے دوستوں کے ساتھ بازار گئیں تھیں۔ فقیروں نے تنگ کیا تھا "میم صاحب"، "میم صاحب"، کہہ کر پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا، تمہیں ان سے نفرت ہو رہی تھی۔ گھن آ رہی تھی، وہ سیاہ اور غلیظ عورتیں تھیں۔ اور یونہی ننگے بچے بھی، تمہارے ساتھ دوسری ہندوستانی لڑکیاں تھیں، انہیں بھی ان سے نفرت تھی —— مگر وہ فقیر عورتیں مجھے ان سے نفرت نہیں وہ بھی میرے ملک کی لڑکیاں تھیں، ان کا رنگ سیاہ تھا، وہ غلیظ تھیں، انہیں عمر بھر صابن سے نہانا نصیب نہیں ہوا۔

کیا کہا، تمہیں تعجب ہے، اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے، ہندوستان میں اکثر ایسی تعجب خیز باتیں ہوتی ہیں، یہاں پچاس لاکھ آدمی روٹی نہ ملنے کی وجہ سے مر گئے، جنگ میں ہندوستان کے اتنے آدمی نہیں مارے گئے —— ہم ہندوستانی ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی سہی مگر بنگال میں کم آدمی نہیں مرے، یہ عورتیں بھی شاید اسی طرف کی ہوں گی، قحط اور وباؤں کی وجہ سے وہ اپنے گھروں سے بھاگ کر

ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں، ان کی غزالیں آنکھیں بذات خود ایک جادو ہوتی ہیں اور اُن کے بال، بنگال کی زلف مشہور ہے،
ان کے بال، ان میں کوئی جاذبیت نہ تھی، میں مانتا ہوں، وہ بھورے ہو رہے تھے، مٹی سے اٹے ہوئے تھے، الجھے ہوئے تھے ——
ہاں انہیں کبھی شامپو نہیں ملا مگر قحط سے پہلے —— تم لوگ ابھی تک یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ بنگال کا جادو مشہور ہے، وہاں آدمیوں کو مکھیاں بنا کر دیواروں سے چپکا دیا جاتا تھا، جہاں کے جنگلوں میں —— مگر اب بنگال کا قحط مشہور ہے، آسام اور بہار کے سیلاب اور ہندوستان کی جہالت اور غربت، بنگال میں پچھلے دنوں خدا جانے کس جادو نے انسانوں کو مکھیاں بنا کر دیواروں سے نہیں سڑکوں، گلیوں اور پیدل چلنے والی پٹڑیوں پہ چپکا دیا تھا۔

تم جب گھر جاؤ تو وہاں کے رہنے والوں سے ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے میں کھیلے گئے اس جادو کا ذکر کر دینا اور اس اژدھے کا ذکر بھی کر دینا جو برما سے ہندوستان کے راستے میں پل کھائے لیٹا پڑا تھا اور جب وہاں سے لوگ بھاگے ہیں تو اس کالے اژدھے نے بیشمار لوگوں کو نگل لیا، اتنے آدمی جاپانیوں کی بمباری سے نہیں مرے جتنے اس اژدھے نے نگل لئے ——

تمہارا منہ حیرت سے کھلا ہے، تمہاری ان خوبصورت آنکھوں میں خلا سا ہے، تمہارے تو سیں بناتے ہوئے نازک گلابی ہونٹ، ان کی لپ سٹک اس ہلکی سی روشنی میں بھی نمایاں ہے، میں اپنے کمرے میں زیادہ روشنی نہیں کرتا، روشنی سے ہر چیز عریاں سی ہو جاتی ہے۔ مجھے شام کے اس دھندلکے سے اُنس ہے —— اور یوں تو مجھے ہر سانولی سلونی چیز سے لگاؤ ہے، بنگال کی لڑکیوں میں بھی میرے لئے ایسی ہی کشش ہے، وہ لڑکیاں جنہیں تم نے بازار میں دیکھا تھا اسی طرف کی رہنے والی ہوں گی، اسی بنگال کی جہاں بوس رہتا تھا۔

بوس کی زندگی کے متعلق بھی اس وقت یہی گومگو کا عالم ہے، اس کے حالات کے گرد بھی ممکنات اور ناممکنات کا ہلکا سا سیاہ پردہ ہے ——
وہ ہندوستان سے کیوں چلا گیا، تمہاری حکومت کے ڈر سے، نہیں میکار تھی، اس کے وقار سے تو اس نے ٹکر لی، اسے یہاں کے ایک بہت بڑے سادھو نے نکالا تھا، اس نے اپنے تپ کے زور سے اسے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا، آج بازار میں میں تمہیں اس کی تصویر بھی دکھاؤں گا۔

تمہیں یہ سب باتیں کہانیاں معلوم ہوتی ہیں، ہم لوگ کہانیاں سنانے میں یوں ہی مشہور ہیں۔ ایک عرصے سے، جب اس ملک میں کھانے پینے کی ہر چیز کثرت سے ملتی تھی، ہر طرح کا سکھ چین نصیب تھا تو یہاں کے لوگ گھروں سے باہر، گھروں کے اندر، سردیوں کی راتوں میں الاؤ کے گرد اور گرمیوں کے موسم میں کھلی چاندنی کے نیچے جمع ہو جاتے تھے اور بڑے بوڑھے انہیں آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں سناتے، نئی نئی اور عجیب عجیب کہانیاں طلسم اور جادو کی باتیں ——

آج ہمارے یہاں جادو بہت ہوتے ہیں، تم بچی رہنا، آج رات کے چراغاں میں تمہارے معصوم رخساروں پہ کھیلتی ہوئی سرخی اور نکھر آئے گی، تمہارے یہ خوبصورت سنہرے بال سونے کی تاروں کی طرح چمک اٹھیں گے، تم ایک دیوی کی مانند نظر آؤ گی، لوگ کہیں تمہیں لکشمی کا سروپ سمجھ کر روک نہ لیں ——

تمہارا خیال ہے میں مذاق کر رہا ہوں، یہ محض خیال ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں آج رات چراغاں ہوگا، ہر گلی، ہر کوچے، ہر بازار میں روشنیاں ہوں گی، رنگ برنگی روشنیاں، اور ان روشنیوں سے فروزاں فضا میں بچے بوڑھے اور جوان، مرد اور عورتیں اپنا بہترین لباس پہنے ان کا نظارا کریں گے ——

تمہیں یہ چیزیں بہت رومان پرور معلوم ہوتی ہیں، ہاں، پہلے زمانے میں یہاں بھی رومانی چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو یہ لوگ اپنی زندگیوں کی تاریکی کا منہ چڑاتے ہیں۔ ان روشنیوں اور زرق برق لباسوں میں تمہیں مسخ شدہ چہرے، اور خون کی کمی کے مریض دکھائی دیں گے۔ روشنی میں

ہر چیز عریاں دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے مجھے شام کے دھندلکے کی روشنی پسند ہے، سگرٹ کے دھوئیں کی مانند ——

نیا سگرٹ سلگالو، چائے اور سگرٹ کا امتزاج بڑی کیف آور چیز ہے، "ہاں سلگاؤ"، میں بھی سلگاؤں گا" مجھے سگرٹ نوشی کی کوئی خاص عادت نہیں، کبھی کبھی جب سے ہی زیادہ روشنی ہو، یا میرے ساتھ کوئی سفید لڑکی بیٹھی ہو تو میں سگرٹ سلگا لیا کرتا ہوں تاکہ روشنی کو اس کے سلیٹی دھوئیں سے رنگ سکوں، اور میں سگرٹ کو جلا کے سلگنے کے لئے انگلیوں میں تھامے رکھتا ہوں،

دیا سلائی کی روشنی میں تمہارا چہرہ جگمگا سا اٹھا ہے، جیسے یہ شعاعیں خود تمہارے چہرے سے نکل رہی ہیں۔ یہی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے میں سگرٹ کو اچھا سمجھتا ہوں ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں، میرے کمرے کی نیم تاریکی میں ایک لمحے کے لئے ایک شعلہ سا چمک اٹھتا ہے جیسے زندگی میں کبھی کبھی کہیں کہیں امید سر اٹھاتی ہے، ایک حسین چہرہ جگمگاتا ہے، دو ارغوانی لب دکھائی دیتے ہیں اور میرا دماغ پھر اپنے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے اور سگرٹ آہستہ آہستہ دھواں بکھیرتا رہتا ہے۔ جیسے زندگی سلگتی رہتی ہے —— اور جب اس کی بے رنگی سے تنگ آ جاتا ہوں تو ایک آدھ کش لگا لیتا ہوں —— سگرٹ فضا کو رومانی بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی مدد سے انسان خود کو کامیاب دھوکا دے سکتا ہے، اور یوں تو ہر رومان دھوکا ہوتا ہے، تم لوگوں کے رومان بھی، ولیم اس دھوکے میں کہ وہ امریکن اسے ساتھ لے جائے گا اس سے دوستی بڑھا رہی ہے اور وہ امریکن خود کو دھوکا دینے کے لئے اس پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتا ہے اور یونہی اس بنگالی کرسچین لڑکی نورا کا رومان جو ریڈیو پہ بنگالی سنگیت کا پروگرام لینے کی خاطر وہاں کے ایک آدمی سے راہ و رسم پیدا کر رہی ہے ——

تم ہنس رہی ہو اور اس ہنسی سے تمہاری معصومیت میں ذرا ذرا شوخی شامل ہو رہی ہے، تمہارے سپید دانت چمک رہے ہیں، دو حسین شفاف موتیوں کی قطاریں، تم مسکراتی ہوئی ایسے ہی نظر آ رہی ہو جیسے "For whom the bell tolls" فلم میں انگرڈ —— انگرڈ بھی اچھی لڑکی ہے، تمہیں پسند ہے نا! اس میں بھی معصومیت پائی جاتی ہے —— مگر ہیڈی لمار کی اور بات ہے، یہ تصویر میں نے پچھلے ہی دنوں اس کی نئی فلم دیکھنے کے بعد خریدی تھی اور مجھ سے میرے کئی ایک دوست اس کے متعلق پوچھ چکے ہیں، ایک آدھ نے تو اڑا لے جانے کی دھمکی بھی دی ہے مگر میں اسے کسی کو لے جانے نہ دوں گا۔ مجھے اس کی یہ تصویر بیحد پسند ہے ——

لیکن تم بھی اس سے کم حسین نہیں ہو، تمہارے یہ ریشمیں سنہرے بال، یہ کتابی چہرہ، یہ جھکی جھکی معصوم نگاہیں، یہ پتلے پتلے نقش اور یہ نازک عنابی ہونٹ اور معصوم مسکراہٹ، بھولی باتیں —— جانے سے پہلے تم مجھے اپنی ایک تصویر دے جانا، میں اسے اس تصویر کے سامنے لگا دوں گا!

تمہارا خیال ہے میں یہ سب خوشامد کے طور پر کہہ رہا ہوں، رومان دھوکا —! نہیں میکا رتھی! تمہیں یہ معلوم ہے میں انگریزوں سے نفرت کرتا ہوں، مگر پھر بھی تم کس قدر معصوم ہو — حسین اور معصوم۔

اندرئیف

ترجمہ:- عبدالرحیم شبلی

ـــــ اور وہ ہنستی رہی!

ساڑھے چھ بجے مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اور میں اضطراب انگیز مسرت محسوس کر رہا تھا۔ میرا اوور کوٹ جس کا صرف اوپر کا بٹن بند تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ لیکن مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے سر پر سکول کے بچوں کی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اور اسے میں نے پیچھے کی طرف کھسکا کر ذرا ٹیڑھا کر لیا تھا۔ میری گردن غرور سے اکڑی ہوئی تھی۔ اور میں راہگیروں کو اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُن پر احسان جتا رہا ہوں، یا جیسے اُن پر اپنے دکھاوے کی بہادری کا رعب ڈال رہا ہوں۔ لیکن عورتوں کو میں لجاجت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اس عورت کی محبت میں مبتلا ہوئے ابھی چار دن بھی نہ گزرے تھے۔ میں اتنا نوجوان اور دل پھینک واقع ہوا تھا کہ دوسری عورتوں سے بے پروا رہنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے، بہادرانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن میری چال سے لاابالی پن کا اظہار ہو رہا تھا۔

پونے سات بجے میرے اوور کوٹ کے اوپر کے دو بٹن بند ہو گئے۔ اور میں صرف عورتوں کی طرف دیکھنے لگا ـــــ لیکن پیار کی نظروں سے نہیں، نفرت آلود نگاہوں سے ـــــ میں صرف ایک عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔ باقی سب عورتیں بے شک بھاڑ میں جائیں۔ کیونکہ وہ میرے رستے میں حائل تھیں۔ لیکن یہ سب عورتیں اُس ایک عورت سے کچھ اتنی مشابہ تھیں کہ میری خود اعتمادی متزلزل ہو گئی۔ اور میں شک و شبے میں پڑ گیا۔

سات بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ مجھے گرمی محسوس ہوئی۔

سات بجنے میں دو منٹ تھے کہ میرا بدن ٹھنڈا پڑنے لگا۔

عین سات بجے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے گی۔

ساڑھے آٹھ بجے میں حسرت و یاس کا پیکر بن چکا تھا۔ میرے اوور کوٹ کے تمام بٹن بند تھے، کالر اوپر اُٹھا دیا گیا تھا، اور ٹوپی کھینچ کر ناک پر رکھ لی گئی تھی۔ کیونکہ ناک کی پھننگ سردی سے نیلگوں ہو رہی تھی۔ میرے بال، میری ناک، مونچھیں، اور میری پلکیں برف کی وجہ سے سفید ہو چکی تھیں۔ اور میرے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ میرے گھسٹ گھسٹ کر چلنے اور جھکی ہوئی کمر سے خیال ہو سکتا تھا۔ کہ کوئی جواں ہمت بوڑھا اپنے دوستوں سے مل کر "کنگال گھر" کو واپس جا رہا ہے۔

یہ تبدیلی اُسی ایک عورت کے باعث ظہور میں آئی تھی۔ ہائے کمبخت! ـــ لیکن نہیں، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ ممکن ہے اُسے آنے کی اجازت نہ ملی ہو۔ یا ممکن ہے وہ بیمار ہو۔ یا ممکن ہے مر ہی چکی ہو ـــ مر چکی ہے؟ ہائے۔ اور میں اسے برا بھلا کہہ رہا ہوں!

"شاہدہ بھی آج رات وہیں ہو گی۔" میرے ایک ہم جماعت نے کہا۔ وہ یقیناً میرا دشمن نہیں تھا۔ کیونکہ اُسے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس سردی میں سات بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک شاہدہ ہی کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

"واقعی؟" میں نے پوچھا۔ لیکن دل ہی دل میں کہہ اُٹھا۔ "ہائے کمبخت!"

وہ پروفیسر زاہدی کی دعوت پر شام کے وقت وہیں ہو گی میں پروفیسر کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ لیکن میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو آج رات اُس کے گھر ضرور جاؤں گا۔

"حضرات!" میں نے خوشی میں آکر کہا۔ "آج کرسمس کی رات ہے۔ آج ہر شخص خوش ہے۔ آؤ ہم بھی خوشی منائیں۔"

"لیکن کس طرح؟" ایک ہم جماعت نے افسردگی کے لہجے میں کہا۔

"لیکن کہاں؟" دوسرے نے پوچھا۔

"آؤ۔ ہم بھیس بدل لیں۔ اور آج رات شہر کی تمام دعوتوں میں شریک ہوں۔" میں نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس مشورے کو خوشی کے نعروں کے درمیان فوراً قبول کر لیا گیا۔ لڑکے نہ صرف خوشی کے مارے ناچنے لگے اور شور مچانے لگے۔ بلکہ اُنہوں نے میری تجویز کا شکریہ بھی ادا کیا۔ ہمارے پاس جتنے پیسے تھے وہ سب یکجا کر لئے گئے۔ اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہم شہر کے دس لڑکے بازاروں میں گھومنے لگے۔ ہم شریر بچوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ اور ناچتے ناچتے ہم پوشاک فروش کی دکان میں جا گھسے۔ جہاں کی فضا رات کی خنکی اور قہقہوں سے معمور تھی۔

میں کوئی ایسا لباس چاہتا تھا۔ جو سیاہ رنگ کا ہو۔ خوبصورت ہو۔ اور اُس میں افسردگی کی جھلک پائی جائے۔ میں نے پوشش ساز سے کہا کہ مجھے ہسپانوی امیرزادے کا لباس دے دو۔

لیکن جو پوشاک مجھے ملی وہ کسی طویل القامت امیرزادے کی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اُسے پہنتے ہی میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک بہت بڑے خالی کمرے میں تنہا کھڑا ہوں۔ میں نے بہروپ اُتار پھینکا۔ اور کوئی دوسری پوشاک طلب کی۔

"کسی مسخرے کے کپڑے دے دوں؟ لہریا رنگ کے ہوں گے۔ اور اُن کے ساتھ گھنٹیاں بھی لگی ہوں گی۔" دکاندار نے پوچھا۔

"مسخرے کے کپڑے؟" میں نے نفرت آلود لہجے میں کہا۔ "اچھا ڈاکو کے کپڑے دے دو۔ اور اُن کے ساتھ ایک ہیٹ اور خنجر بھی ہو۔"

خنجر! یہی چیز دراصل میری اُس وقت کی ذہنی کیفیت کے عین مطابق تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جس ڈاکو کے کپڑے مجھے مہیا کئے گئے۔ وہ بہت کمسن معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے آٹھ برس کی عمر ہی میں وہ "بگڑا ہوا بچہ" کہلاتا ہو۔ اُس کی ٹوپی مجھے پوری نہ آتی تھی۔ اور جب میں نے اُس کا مخملی پاجامہ پہنا تو وہ اتنا تنگ نکلا کہ مجھے چھیل کر اُتارنا پڑا۔ پھر مجھے ایک نوکر کے کپڑے دیئے گئے۔ لیکن وہ کوڑی کام کے نہیں تھے۔ ان پر جگہ جگہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک راہب کے کپڑے دیکھے تو ان میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔

"بھئی۔ کیا کر رہے ہو؟ جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔" میرے ساتھی اپنا اپنا سوانگ بھر کر چلانے لگے۔ اب دکان میں صرف ایک پوشاک باقی رہ گئی تھی۔ اور وہ چین کے کسی نواب زادے کی تھی۔

"مجھے چینی کے کپڑے دے دو۔" میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ اور پوشاک مجھے مل گئی۔ مجھے احمقانہ رنگ دار سلیپروں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ اتنے چھوٹے تھے۔ کہ میرے نصف پاؤں بھی اُن میں بمشکل سما سکتے تھے۔ اسی طرح گلابی رنگ کی ٹوپی کا ذکر بھی بے سود ہے۔ کیونکہ اس کی ڈوری کو کان سے باندھنا پڑتا تھا اور اسے پہن کر میں بالکل چمگادڑ معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے بعد نقاب کی باری آئی۔ بس نقاب کی کچھ نہ پوچھئے۔ اس میں ناک بھی تھی۔ آنکھیں بھی تھیں۔ ایک منہ بھی تھا۔ اور سب اعضا اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھے۔ لیکن اُن میں 'انسانیت' کہیں نظر نہ آتی تھی۔ نقاب، کیا تھی؟ ایک عجیب سا مصنوعی چہرہ تھا۔ جو اتنا پرسکون اور سنجیدہ دکھائی دیتا تھا کہ قبر میں بھی انسان اتنا پرسکون اور سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت سے نہ تو خوشی کا اظہار ہوتا تھا، نہ غم کا —— بلکہ سچ پوچھئے تو کسی جذبے کا بھی اظہار نہیں ہوتا تھا۔ نقاب کی آنکھیں سیدھی آپ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور آپ اُس کے خدوخال دیکھ کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے نقاب چہرے پر اوڑھی تو میرے ساتھی ہنستے ہنستے صوفے پر دوہرے ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر قہقہے لگانے اور کرسیوں پر گرنے لگے۔

"یہ بالکل نئی چیز ہے۔" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ غم کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ لیکن جب میں نے آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ تو میں بھی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ واقعی یہ بالکل نئی چیز تھی۔

"ہمیں قسم کھا لینی چاہیئے۔ کہ ہم کسی حالت میں بھی اپنی نقاب نہیں اُتاریں گے۔" ایک لڑکے نے دُکان سے باہر نکلتے ہی کہا۔ "ہمیں اپنی عزت کی قسم۔"

"ہمیں اپنی عزت کی قسم۔ ہمیں اپنی عزت کی قسم۔" ہم سب ایک ساتھ بولے۔

واقعی چہرے کی یہ نقاب بڑی عجیب چیز تھی۔ تماشائیوں نے میرا تعاقب کیا، مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میرا مذاق اُڑایا، مجھ پر قہقہے لگائے، میری چٹکیاں لیں۔ اور جب میں تنگ آگیا تو میں نے غضبناک ہو کر ہجوم کی طرف دیکھا۔ لیکن ایک ناقابل ضبط قہقہے نے میرا استقبال کیا۔ رستے میں بھی ہنسی کا طوفان برابر اُٹھتا رہا۔ اور میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ لیکن اس مجنونانہ کھلکھلاہٹ کی جھنکار سے میں پیچھا کیوں کر چھڑا سکتا تھا؟ بعض اوقات میں بھی موج میں آجاتا تھا۔ میں شور مچانے لگا، گانے لگا، اُچھلنے لگا۔ اور مجھے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ جیسے میں نے بے تحاشا پی لی ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ شور و شغب مجھ سے کتنا دور تھا ـــ! میں نقاب کے نیچے اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

آخر تماشائیوں نے میرا تعاقب چھوڑ دیا۔ میں پروفیسر زاہدی کے گھر پہنچ گیا۔ اور اُس لڑکی سے میری ملاقات ہوئی!

میں اُس کی طرف لگاتار دیکھتا رہا۔ میرے دل میں یکے بعد دیگرے غصے اور خوف، ناراضی اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے رہے۔

"یہ میں ہوں!" میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

اس کی موٹی موٹی پلکیں آہستہ آہستہ اوپر اُٹھیں۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کی تاریک آنکھوں کے ترکش سے نگاہوں کے سارے تیر نکل کر مجھ پر برس پڑے ـــ اور اچانک وہ ہنسنے لگی۔ وہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ جیسے بہار کا سورج ہنس رہا ہو۔

"یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔" میں نے دو دفعہ کہا۔ اور مسکرانے لگا۔ "آج شام تم آئی کیوں نہیں؟"

لیکن وہ ہنس رہی تھی۔ ہنسے جا رہی تھی۔ لگاتار قہقہے لگا رہی تھی۔

"میں تھک گیا ہوں۔ میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا کہ شاید وہ میری بات کا جواب دے سکے۔

لیکن وہ پاگلوں کی طرح ہنستی رہی۔ اس کی تاریک آنکھوں کی چمک مدھم پڑ گئی۔ اور اس کی کھلکھلاہٹ واضح سے واضح تر ہونے لگی۔ بے شک وہ بہار کے مسکراتے ہوئے سورج کی مانند نظر آرہی تھی۔ لیکن یہ سورج جھلسا دینے والا اور ظالم تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے تنگ آکر کہا۔

"یہ تم ہو؟" اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم کتنے مضحکہ خیز نظر آتے ہو!"

میرے کندھے جھک گئے اور میں نے اپنا سر خم کر لیا۔ میرا چہرہ درد سے اینٹھنے لگا۔ وہ منہ پھیر کر ان نوجوانوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ جو ہنستے کھیلتے ہمارے پاس سے گزر رہے تھے اُس کے چہرے پر جیسے ہنسی کی شفق غروب ہو رہی تھی۔

"یوں ہنسنا تو بڑی بے حیائی ہے۔" میں نے آخر کہہ ہی دیا۔

"کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اس نقاب کے نیچے ایک جیتا جاگتا، غمزدہ چہرہ ہے؟ میں نے تو محض تمہارے دیکھنے کے بہانے اسے پہن لیا تھا۔ تم نے مجھے اپنی محبت کی اُمید دلائی تھی۔ لیکن اب اتنی جلدی اور اس ظالمانہ طریقے سے اُسے خاک میں ملا رہی ہو؟ تم شام کو آئی کیوں نہیں؟"

وہ جلدی سے میری طرف متوجہ ہوئی۔ جیسے اُس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر جواب مچل رہا ہے۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ کھلکھلا

کر ہنس پڑی۔ اُس نے اتنے قہقہے لگائے کہ وہ ہانپنے لگی۔ اور اُسے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اُس کی ہنسی تقریباً ایک چیخ بن گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ زرتار، معطّر رومال سے ڈھانپ لیا۔ پھر اُس نے بڑی مشکل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ وہ سامنے آئینہ پڑا ہے۔ ذرا منہ پھیر کر اُس میں دیکھو تو سہی۔ واللہ۔ کیا چہرہ پایا ہے!"

میں نے اندرونی کرب سے بے تاب ہو کر اپنے ابرو سکیڑے اور دانت کچکچائے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ ٹھٹھر کر منجمد ہو گیا ہے اور اس پر ایک مرگ آسا زردی رینگ رہی ہے۔ میں نے آئینہ میں دیکھا — ایک احمقانہ سکوت، ایک بے حس و حرکت، لا اُبالیانہ، غیر انسانی اور غیرت متحرک مصنوعی چہرہ مجھے گھور رہا تھا — میں بے اختیار ہنس پڑا — اور ابھی میرا قہقہہ فضا میں گونج رہا تھا کہ میں نے بڑھتے ہوئے غصے کے زیر اثر کانپتے ہوئے اور یاس انگیز جنون میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"تم کیوں ہنس رہی ہو؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں محبت آمیز سرگوشی میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی لجاجت سے گفت گو نہیں کی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے مجھے اتنی گہری محبت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے انتظار سے کتنی کوفت ہوئی۔ اور میں نے مجنونانہ حسد و رشک اور روحانی اذیت سے بیقرار ہو کر کس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی پلکیں جھک گئی ہیں۔ اور ان کا سایہ اُس کے پژمردہ رخسار پر جھلملا رہا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ جو آگ اُس کے سینہ کے اندر دہک رہی تھی۔ اُس کے سُرخ شعلوں کا عکس اُس کے بے رونق چہرے میں جھلک رہا ہے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُس کا نرم و نازک بدن بے اختیار میری طرف جھک رہا ہے —!

اُس نے "ملکۂ شب" کا لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں وہ ایک چیستاں معلوم ہوتی تھی۔ سیاہ رنگ کے لبادے میں وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اُس نے تاریکی اوڑھ رکھی ہو۔ وہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح ضیا افروز تھی۔ وہ بچپن کے بھولے ہوئے خواب کی طرح حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں بولتا رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میرا دل وفورِ مسرت سے دھڑکنے لگا۔ اور آخر میں نے دیکھ لیا — میں نے دیکھا کہ ایک ہلکی سی کریمانہ مسکراہٹ کے زیر اثر اُس کے لب نیم وا ہو گئے ہیں۔ اور اس کی پلکوں میں ایک غیر مرئی لرزش پیدا ہوئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے، لیکن پورے خلوص کے ساتھ آنکھیں اوپر اٹھائیں، اپنا ننھا منا منہ میری طرف کیا اور — میں نے آج تک اس قسم کا قہقہہ نہیں سنا۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ جیسے کراہتے ہوئے بولی۔ اور بے اختیار ہنسنے لگی۔

کاش اُس وقت ایک ہی ثانیہ کے لئے میرا چہرہ انسانی ہو سکتا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ میرے دہکتے ہوئے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اور وہ احمقانہ مصنوعی چہرہ جس کی ہر چیز — ناک، آنکھیں اور ہونٹ۔ اتنی پرسکون، سنجیدہ اور تغافل شعار نظر آتی تھی — حد درجہ بے ہودہ معلوم ہونے لگا۔ میں رنگدار سلیپروں پر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور لنگڑاتے ہوئے بھاگ نکلا۔ لیکن اُس کے گونجتے ہوئے قہقہے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ جیسے اثیری بلندیوں سے کھنکھتی ہوئی چاندی کا دھارا بہہ کر ایک مضبوط چٹان سے ٹکرا رہا ہو۔

ہم خوابیدہ بازاروں میں پھیل گئے۔ اور رات کی خاموشی کو اپنی گھبرائی ہوئی بلند آوازوں سے جگاتے ہوئے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

"تم خوب کامیاب رہے ہو۔ میں نے آج تک لوگوں کو اس طرح ہنستے نہیں دیکھا۔ حوصلہ کرو۔ تم کیا کر رہے ہو؟ نقاب کیوں پھاڑ رہے ہو؟ دیکھنا بھائیو۔ یہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا۔ ارے دیکھو، وہ اپنے لباس کو پھاڑ رہا ہے .... وہ رو رہا ہے!"

ابو سعید قریشی

ایک رات

(ریڈیائی رو پک)

(موسیقی .... سنجیدہ اور طول جس سے تاریکی کا احساس ہو)

راوی ۱:- ایک رات .... لیکن شام کی رات نہیں۔

راوی ۲:- مقیشی دوپٹے، سرمئی آنکھوں — چھاپا پٹ کی مانگ اور جگنوؤں کے آویزوں والی رات نہیں

راوی ۳:- بلکہ اس دنیا کی ایک رات۔

راوی ۲:- بہتے وقت کا سایہ۔ ...... انسانوں کی دنیا پر اُجالے کی پرچھائیاں۔

راوی ۱:- لیکن ان پرچھائیوں میں اور پرچھائیاں نظر آرہی ہیں — گہری اور کالی، آسمان کو چیرتی ہوئی اور زمین پر رینگتی ہوئی۔

راوی ۲:- یہ انسانوں کے گھر ہیں۔ اونچی اونچی ماڑیاں۔ اور نیچے نیچے گھروندے۔

راوی ۱:- ماڑیوں کے چہروں پر روشنی کے چاک چمک رہے ہیں۔ اور گھروندوں کے سینوں پر اندھیرے کے داغ دکھائی دے رہے ہیں۔

راوی ۲:- آیئے دیکھئے اور سنیئے کہ ان روشن آنکھوں والے محلوں اور اندھے گھروندوں کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

راوی ۱:- آیئے، دیکھئے اور سنیئے۔ (موسیقی ..... نومولود بچے کے رونے کی آواز — کھسر پھسر اور پھر بین کرنے کی آواز)

ایک بڑھیا:- (بین کرتی ہوئی) ہائے ری بٹیا تو کہاں چلی گئی... تجھے جانا تھا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتی۔ ہائے ری میری لاڈلی۔

ایک نوجوان عورت:- صبر کرو چاچی صبر کرو۔ بھگوان کو یہی منظور تھا۔

بڑھیا:- بھگوان ...... ارے میرا گھر اُجڑ گیا اور تو کہتی ہے بھگوان میری کوکھ خالی ہو گئی۔ اور تو کہتی ہے بھگوان کو یہی منظور تھا۔ کہاں ہے وہ تیرا بھگوان ذرا میں بھی تو پوچھوں کہ میری اکلوتی کو لیکر اس کے ہاتھ کیا آگیا ..... بھگوان۔

ایک جوان مرد:- (بڑھیا کا داماد مرنے والی کا شوہر، (روتی ہوئی آواز میں) ایسا نہ کہو ماسی ایسا نہ کہو۔ ایسا کہنا پاپ ہے۔

بڑھیا:- (قدرے سنبھل کر لیکن غصے سے ہانپتے ہوئے) پاپ ہے .... پاپ ہے۔ اور کسی کی کوکھ خالی کر دینا پاپ نہیں — پر تجھے کیا۔ تو تو کل کو دوسری لے آئے گا۔ گھاؤ تو میرے لگا ہے۔ (سینہ کوٹتی ہے) یا اس کے (بچے کے رونے کی آواز) جس کی ماں مر گئی۔ اور تو کہتا ہے پاپ ہے ...... (بین اور بچے کے رونے کی آواز)

سادھو:- پاپ ہے جیون مرن سب پاپ ہے۔ مایا ہے سب مایا۔ یہ گورے گورے گال یہ کالے کالے بال، مایا ہے سب مایا — جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ نہیں۔ جو کچھ تو نہیں دیکھتا وہ ہے۔ — سادھو ایک سو سال سے چلا رہا ہے۔ لیکن بہرے نہیں سنتے۔ ایک سو سال سے نگر نگر گھوم کر چیخ رہا ہے۔ مگر مورکھ نہیں سمجھتے۔ سمجھ جاؤ مورکھ اب بھی سمجھ جاؤ۔

سٹہ باز ۱:- سنا تم نے سادھو مہاراج نے کیا کہا۔

سٹہ باز ۲:- ہاں، اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ سمجھ جاؤ۔ مورکھو اب بھی سمجھ جاؤ ......

سٹہ باز ۳:- تو اس کا کیا مطلب نکلا۔

سٹہ باز ۲:- یہی کہ سو نمبر گھوڑے پر بازی لگاؤ۔

سٹہ باز ۱:- (ہاتھ پر ہاتھ مار کر) ہاں! .... یہ بات ہے! ۔ اب سمجھو کہ دن پھر گئے۔

سٹہ باز ۲:- اب جورو کا سارا زیور بکا بکایا۔ گہنا لوٹ آئیگا — (ہنستا ہے)

سٹہ باز نمبر ۱:- کیا نمبر تھا بھلا۔

سٹہ باز نمبر ۲:- نو۔

سٹہ باز نمبر ۱:- ہاں۔ اب نہ بھول جائیو۔

سٹہ باز نمبر ۲:- نہیں۔ نہیں اب نہیں بھول سکتا ..... نو .....

سٹہ باز نمبر ۱:- (بے یقینی سے) ہاں، مگر سنو تو اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک نمبر کے گھوڑے پر بازی لگاؤ ـــ بنیاں صرف دھوکہ دینے کے لئے ہوں۔

سٹہ باز نمبر ۲:- ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔

سٹہ باز نمبر ۱:- اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ صرف ایک ہی بندی دھوکہ کے لئے ہو اور ایک سچی ہو۔ (یعنی دس، دس نمبر گھوڑے پر بازی لگاؤ۔

سٹہ باز نمبر ۲:- ہاں یہ بھی ممکن ہے یوں بھی اور یوں بھی۔

سٹہ باز نمبر ۲:- کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (موسیقی جس سے الجھن کا پتہ چلے)

سٹہ باز نمبر ۱:- ہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (موسیقی اور بھی بلند ہو جائے اور چند سیکنڈ تک مختلف ساز الگ الگ اور بے سرے بجیں۔ اس کے بعد سنبھل جائیں اور پھر وہی سنجیدگی)

سلیم :- (ایک ہرجائی مرد) کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن نہیں تم مجھے اس طرح نہیں ٹال سکتیں۔ وعدہ کرو زمرد وعدہ کرو۔ کہ تم مجھ سے شادی کر لوگی۔

زمرد :- (ایک طوائف) ہم لوگ وعدے نہیں کیا کرتے سلیم۔

سلیم :- نہیں! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا! وہ مر رہی ہے۔ دق سے مر رہی ہے اور جب وہ مر جائے گی تو میرا کیا ہوگا۔

زمرد :- (زہر خند) ..... اب اس کی طرح مجھے بھی مار ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟

سلیم :- یوں نہ کہو زمرد، یوں نہ کہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو۔

زمرد :- تمہاری بیوی بھی تو کبھی اتنی ہی عزیز ہو گی۔

سلیم :- لیکن وہ مر رہی ہے۔ تم سمجھتی نہیں وہ مر رہی ہے۔

زمرد :- اور تم اسے قبر میں دھکا دینا چاہتے ہو۔ میں طوائف ہی سہی، لیکن اتنی بے رحم نہیں کہ ایک ہرجائی مرد کی بیمار بیوی کو جیتے جی قبر میں گاڑ دوں۔ اور ..... اور پھر ضمیر کے کوسنے سہنے کو اس کی جگہ تمہارے گھر میں بند ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا دن آئے۔

سلیم :- میں تمہیں یقین دلاتا ہوں زمرد کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری بیوی کو تم تھوڑی مار رہی ہو۔ وہ تو خود ہی مر رہی ہے۔ اس میں تمہارا میرا یا کسی اور کا کیا قصور ہے۔ تمہارا ضمیر تمہیں کیوں کوسے گا۔ مان جاؤ زمرد۔ وعدہ کرو میرے ہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم میرے دل کی ملکہ بن کر میرے گھر پر راج کرو گی۔

زمرد :- (طنز) ۔ تمہارا راج تمہیں کو مبارک ہو۔ مجھے اس کی خواہش نہیں۔ تم ایسے شرفا کی مہربانیوں سے میری عمر مزے میں کٹی ہے۔ بڑے سے بڑا سیٹھ، بڑے سے بڑا واعظ اور بڑے سے بڑا مہاتما میرے ہاں آتا ہے۔ اور میری دہلیز پر ناک رگڑتا ہے دولت، شہرت۔ نوکر چاکر مجھے کیا میسر نہیں کہ میں کسی دوسری زندگی کی خواہش کروں۔

سلیم :- لیکن محبت زمرد۔ محبت۔ میں تمہیں اپنی محبت پیش کر رہا ہوں۔

زمرد :- اب مجھے ہنسی آنے لگی ہے۔ جب تم جیسا جہاں دیدہ مرد ایک تجربہ کار طوائف کو محبت کے معنی سمجھانا چاہے تو .....

سلیم :- میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا زمرد۔

زمرد :- اور جب مجھے دق ہو جائے گی تو کسی اور کی طرف متوجہ ہو گے! تم ایسے مردوں کے دیدے کبھی نہیں بھرتے۔ تم نے جب اپنی بیاہتا بیوی کو نہ جانا تو مجھ ایک بازاری عورت کو کیا جانو گے۔

سلیم :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا نہ جانے تم اتنی ہٹ دھرمی کیوں کر رہی ہو۔ حالانکہ تم خوب جانتی ہو کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے حسن کی قسم زمرد اگر تم نے میری التجا ٹھکرا دی تو میں مر جاؤں گا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمرد :- (ہنستی ہے) کوئی نئی بات کیجئے سلیم صاحب۔ یہ دھمکی تو مجھے بیسیوں نے دی لیکن مرا تو ایک نہیں۔ ایک بزرگ مارنے

تو اسپرٹ پی کر جان دینی چاہی تھی لیکن وہ شراب کے عادی تھے حلق سے اتری تو اور بھی ہوشیار ہو گئے اور کہنے لگے کہ ذرا ایک بوتل شراب تو منگا دینا میرے پاس پیسے نہیں ہیں (ہنستی ہے)

سلیم :- خدارا اتنی بے رحم نہ بنو زمرد۔ یہاں جان پر بنی ہے۔ اور تمہیں دل لگی سوجھ رہی ہے۔ تنہائی کے خوف سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے زمرد! تم انکار کر رہی ہو اور وہ مر رہی ہے۔ ذرا حقیقت کی روشنی میں میرے گھر کی ویرانی کا تصور کرو۔ اور پھر کہو کہ تمہاری ضد کہاں تک حق بجانب ہے۔ لیکن شاید تم نہیں جان سکتیں کہ اکیلا پن کسے کہتے ہیں۔ تم .... تم .....

زمرد :- (ایک اداس قہقہہ لگاتی ہے اور پھر طنزیہ لیکن غمگین انداز میں) تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اکیلے رہنے کا کیا علم۔ (موٹر کے ہارن کی مبہم آواز کسی خاص قسم کے موٹر کے ہارن کی آواز)۔

اے لو سیٹھ لکھی رام کی کار بھی آ گئی۔ اب میں چلتی ہوں۔

سلیم :- لیکن جانے سے پہلے اتنا بتاتی جاؤ کہ میں کیا کروں؟

زمرد :- گھر جاؤ اپنی بیوی کی تیمارداری کرو اور اپنی مغفرت کے لئے خدا کی بارگاہ میں دعا کرو۔ میں بھی تمہارے لئے دعا کروں گی۔

(وقفہ)

سلیم :- (آہ بھرتے ہوئے) اللہ جانے اب میرا کیا بنے گا ..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں بالکل اکیلا رہ جاؤں گا۔ (صرف وائلن پر بھیم. اور تھوڑی دیر بعد اور ساز بھی شامل ہو جائیں)۔

(موسیقی ابھرے اور مدھم ہو جائے۔ کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز)

چودھری فقیر الدین :- (مکان کے اندر سے دور سے آواز آتی ہے) کون ہے بھئی کون ہے۔ (دروازہ کھلتا ہے)

تار والا :- چودھری فقیر الدین کا گھر یہی ہے ....

چودھری :- ہاں۔ ہاں۔ میں ہی فقیر الدین ہوں۔ ..... خیریت۔

تار والا :- آپ کا تار۔

چودھری :- میرا تار۔ ..... ہوں (لفافہ چاک کرنے کی آواز) بیگم بیگم (زینے پر چڑھنے کی آواز) اری او ننھی کی ماں۔

بیگم :- کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟

چودھری :- لاٹری ..... اری کیا سو رہی ہو۔ ذری بستر سے تو اٹھو۔ یہ دیکھو تار۔ مبارک باد کا تار سوا لاکھ کی لاٹری۔ کیا سنتی ہو میرے نام سوا لاکھ کی لاٹری نکلی ہے (ہنستا ہے)

بیگم :- اب میرا ہار نہ بھول جائیو۔ بہت بڑا ہو موتیوں والا۔

چودھری :- ہاں ہاں، ہار اور کنگن اور بندے اور پازیبیں۔

بیگم :- نہیں اب پازیبوں کا فیشن نہیں رہا کوئی اور فیشن والی چیز ہو۔

چودھری :- میں تمہیں تانگے پر اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ جو تمہارے جی میں آئے وہی لے دوں گا۔ سوا لاکھ کی لاٹری ہے۔ پوری سوا لاکھ کی! ہاتھی بیٹھتا ہے چھاؤں میں

بیگم :- اور ننھی کیلئے بھی تو کچھ لینا ہے۔ ۔ سوچتی ہوں سارا جہیز ابھی بنا لوں۔ بے فکر ہو جاؤں گی۔

چودھری :- ٹھیک کہتی ہو۔ بازار کا کوئی اعتبار تھوڑی ہے۔ گہنا کپڑا برتن سب کچھ ابھی بنا لیں گے ...... سوا لاکھ۔ میں بھی کہوں کہ میری دائیں آنکھ اتنے دنوں سے کیوں پھڑک رہی ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ لاٹری نکلی ہے۔ (ہنستا ہے)۔

بیگم :- یہ لاٹری والے سچ مچ ایماندار ہی نکلے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اپنوں ہی میں بانٹ لیتے ہوں گے۔ (دونوں ہنستے ہیں۔ دستک)۔

چودھری :- ذری کھونٹی سے اچکن تو اتار دو۔ شاید کوئی پڑوسی مبارک باد دینے آیا ہے۔ (پھر دستک) ذرا ٹھہریئے گا۔ ابھی حاضر ہوا، ابھی حاضر ہوا۔ (زینے سے اترنے کی آواز)

تار والا :- فقیر الدین آپ ہی کا نام ہے۔

چودھری :- ہاں ہاں چودھری فقیر الدین۔

تار والا :- آپ کا تار۔

چودھری :- اوہ۔ مبارک باد کا ہو گا ..... میری لاٹری نکلی ہے۔

شاید نھی کے ماموں نے بھیجا ہے۔

تار والا:- کھول بعد میں لیجیے گا۔ پہلے یہاں دستخط کر دیجیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

چودھری:- کہاں دستخط کرنے ہیں مجھے؟ یہاں؟ ہوں..... انگریزی میں یا اردو میں

تار والا:- چاہے ملالم میں کر دیجیے میرے لئے سب ایک ہے۔ لیکن جلدی کیجیے۔

چودھری:- (ایک ایک لفظ پر زور دے کر) چودھری نصیر الدین رئیس اعظم یہ لو اب تو خوش ہو۔ اے ہاں اپنا انعام تو لیتے جاؤ۔

تار والا۔ شکریہ....

چودھری:- (لفافہ چاک کرنے کی آواز) "پہلے تار کو منسوخ سمجھیے۔ لاٹری آپ کے نام نہیں نکلی بلکہ آپ کے ہم نام کے نام نکلی ہے۔ غلطی کیلئے معافی"...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا (موسیقی جس سے الجھن کا احساس ہو)۔

یہ۔ یہ کیسے ممکن ہے (موسیقی اور بلند ہو جاتی ہے) یہ نہیں ہو سکتا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن۔ یہ پہلا تار میرے ہاتھ میں موجود ہے۔ اُف.... (زینہ پر چڑھنے کی آواز)۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اُف میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔ کہاں سوا لاکھ اور کہاں راکھ۔ (زینے سے پھسلنے اور لڑھکنے کی آواز۔ موسیقی، ملول اور سنجیدہ بلند ہو کر مدھم پڑ جاتی ہے)

شرابی:- (بڑبڑاتا ہے) دکھ کے اب دن بیتت ناہیں۔

دوسرا شرابی:- ارے یہ گیت کیوں گا رہے ہو۔ تم کوئی سہاگن تھوڑی ہو۔

پہلا شرابی:- نہیں۔ میں دیوداس ہوں۔ دیوداس۔

دوسرا:- تمہاری پارو کہاں ہے؟

پہلا شرابی:- مجھ سے کسی زیادہ امیر کے گھر۔ (سسکیاں) دکھ کے اب دن بیتت ناہیں۔

دوسرا شرابی:- تم..... تم..... بیٹھ کیوں گئے دیوداس اپنی پارو کو نہیں ڈھونڈو گے؟

پہلا شرابی:- پارو پارو پکاروں میں بن میں۔ موری پارو بسے موہے من میں۔

آتی ہے صدائے جرس ناقہ لیلےٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

حوالدار:- اٹھیے حضرت اٹھیے۔ اب کی وہ یہاں نہیں آنے کی۔ وہ تو کوتوالی میں آپ کی انتظار کر رہی ہے۔ اب ذرا جلدی کیجیے۔ آپ کے کئی اور بھائی بھی اپنی پاروؤں کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ مجھے ان کا بھی تو کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔

شرابی ۱:- کوتوالی..... تو چلو کوتوالی ہی چلو۔ پر میری پارو مجھے مل جائے گی نا!

حوالدار:- ہاں ہاں مل جائے گی۔ مل جائے گی۔

شرابی ۲:- اور مجھے میرا کیمیا کا نسخہ میری عمر بھر کی کمائی۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟ اور میرا کیا نام ہے؟ میرا نام ہے حکیم کیمیاڈس۔ آج بیس برس ہو گئے کہ ایک حریف میرے نسخے اڑا کر لے گیا تھا۔ اس دن سے ڈھونڈ رہا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ تو پاگل ہے۔ تم تو مجھے پاگل نہیں سمجھتے حوالدار صاحب تم تو مانتے ہو کہ پیتل سے سونا بن سکتا ہے۔ پیتل کا سونا۔ کوئلہ کا کندن۔

حوالدار:- ہاں۔ ہاں۔ بالکل پیتل سے سونا بن سکتا ہے۔ اور کوئلہ کا کندن بھی بن سکتا ہے۔ پر اب ذرا رفتار بڑھائیے۔

شرابی ۱:- ٹن..... ٹن..... ٹن....... ٹن۔ بالم آؤ بسو مورے من میں..... (کوئی ایک منٹ بعد)۔

سپاہی:- کہو جی حوالدار جی یہ اور دو پنچھی کہاں سے پکڑ لائے۔

حوالدار:- بس پوچھ نہیں نتھے خان۔ یہ دکھائی دیتا ہے جیسے ان کا دانہ کچھ سستا ہو گیا ہے۔

سپاہی:- (ہنستا ہے)

حولدار:- یہ تو دیوداس ہیں اور اپنی پارو کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

سپاہی:- اور یہ؟

حولدار:- کیمیاگر- کسی دشمن نے ان کی بیاض اڑالی ہے- اور یہ بیس برس سے اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

(لرزہ خیز چیخوں کی آواز)

حولدار:- ہائیں یہ حوالات میں کیا ہو رہا ہے؟

سپاہی:- انہیں کا کوئی بھائی بند ہے۔ صنعت کی مل گئی ہوگی- اب پچھو دیکھ رہے ہیں۔ (چیخیں پھر بلند ہوتی ہیں اور ساتھ ہی کوئی چلائے کہ مجھے کوئی بچاؤ مجھے بچاؤ ــــ فیڈ آؤٹ، موسیقی طول اور سنجیدہ ابھرے اور ڈوب جائے)

لڑکا:- (عمر دس بارہ برس- اسکول کا سبق یاد کر رہا ہے)۔ ہندوستان میں چالیس کروڑ انسان بستے ہیں لیکن اُن کی حالت حیوانوں سے بھی بری ہے- اس کی وجہ یہ ہے ہندوستانیوں کو اپنے تن کے مقابلہ میں اپنی آتما کا زیادہ خیال ہے- کبھی ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا کرتے تھے- لیکن اب ــــ

سنتری:- (ذرا دور سے) ابے او لمڈے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟

لڑکا:- (گھبرا کر) اسکول کا سبق یاد کر رہا ہوں سنتری جی

سنتری:- جگہ تو اچھی ڈھونڈی ہے تو نے سبق یاد کرنے کے لئے یہ سڑک ہے یا تیرے باوا کا گھر- بالو پڑھنے کا اتنا ہی چاؤ ہے تو باوا سے کہہ کر مکان پہ بجلی لگوا لے نا۔

لڑکا:- (اداس) میرا باپ نہیں ہے سنتری جی۔

سنتری:- ہوں..... تو- تو اس میں میرا کیا دوش ہے- مجھے تو بس اتنا معلوم کہ تم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔

لڑکا:- گھر میں تیل کیلئے پیسے نہیں ہیں سنتری جی- اس لئے یہاں آجاتا ہوں یہ سبق یاد نہ ہو تو ماسٹر جی مارتے ہیں۔

سنتری:- تو میرا اس میں کیا قصور ہے- میرے کو تو بس اتنا معلوم ہے- کہ قانون قانون ہے اور قانون کہتا ہے کہ رات کو کوئی آدمی بے فضول ادھر نہیں بیٹھ سکتا- اور بس، راج نگر تک آوارہ گردی کی منا ہی ہے۔

لڑکا:- لیکن میں آوارہ گردی تو نہیں کر رہا ہوں سنتری جی- میں تو اسکول کا سبق یاد کر رہا ہوں۔

سنتری:- ہوں.... ویسے اسکول کے سبق یاد کرنے کے بابت منا ہی کا کوئی حکم میں نے دیکھا تو نہیں پر اتنا ضرور معلوم ہے کہ قانون کی کتاب میں یہ بھی نہیں لکھا کہ اسکول کے لمڈے رات کو سڑک کی بجلی کے نیچے بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے تم یہاں نہیں رک سکتے۔

(دور سے پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں)

سنتری:- ایلو کوئی اور مصیبت آئی!

لڑکا:- کیا ہوا سنتری جی کیا ہوا؟

سنتری:- ابے ہوتا کیا ایک بھوکے نے اپنے سے کم بھوکے کو لوٹ لیا ہوگا- اور کیا ہوا ہوگا- اب یہ بھی کیا میرا قصور ہے- پر میں تو اتنا جانتا ہوں کہ قانون قانون ہے۔ ے اب چلتا ہوا دکھائی دے ــــ

(سیٹیوں کی آوازیں- جیسے کوئی ہنگامہ ہو گیا ہو سنتری دوڑتا ہے-)

لڑکا:- (اپنے آپ سے) قانون قانون ہے- ایک بھوکے نے اپنے سے کم بھوکے کو لوٹ لیا- سڑک کی بجلی کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے کی منا ہی تو نہیں لیکن اس کی اجازت بھی نہیں اور اس میں اس کا کوئی زور بھی نہیں...... کچھ میں نہیں آتا- (گیارہ بجنے کی آواز آتی ہے)۔ ہائیں گیارہ بج گئے (جمائی لیتے ہوئے) اچھا اب گھر چلنا چاہئے اماں راہ تک رہی ہوگی۔

(موسیقی کا ٹکڑا...... موٹر رکتی ہے دروازہ کھلتا ہے)۔

ہسپتال کا ملازم:- سی!..... سر کی چوٹ ہے بھیا.... ذری احتیاط سے ہوں!- اب اٹھاؤ...... (بھری ہے قدموں کی آواز)۔

کمپاؤنڈر (قدرے دور سے قریب آتے ہوئے) کمبخت کوئی اور casualty لے آئے اوئے یار کبھو تو چین سے بیٹھنے دیا کرو۔

ہسپتال کا ملازم:۔ اصل ہوں ـــــ یہاں اس ٹیبل پر.....
احتیاط سے۔ بس!

کمپاؤنڈر:۔ اب ہٹو گے بھی...... ذرا دیکھوں تو کیا ہوا ہے اسے۔ یہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کا ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان کے ماں باپ انہیں رات گئے گھر سے باہر کیوں نکلنے دیتے ہیں۔

ڈرائیور:۔ اجی بابو جی گھر کیا اور باہر کیا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ آئی نہیں ٹلتی۔

کمپاؤنڈر:۔ ہاں! پر یوں دکھائی دیتا ہے کہ اپنے یہاں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی آرہی ہے۔ اس دو گھنٹے میں پانچ کیس آچکے ہیں۔ ذرا روئی تو دینا۔ جمعدار اس کی ناک سے خون تو پونچھ دو۔ اور تم جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ اب کھانا کھا لیا ہوگا۔ ارے اس کے تو کان سے بھی خون بہہ رہا ہے۔ پر یہ ہوا کیسے

ڈرائیور:۔ جی یہ تو پولیس ہی بتائے گی۔ میرے کو تو بس اتنا معلوم ہے کہ فٹ پلاس کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف کتابیں گری پڑی تھیں۔ یوں جان پڑتا ہے۔ کہ کہیں سے پڑھ کر آرہا تھا۔

کمپاؤنڈر:۔ اور ٹرک کے ڈرائیور کا کیا ہوا۔

ہسپتال کا ملازم:۔ موٹر لے کے بھاگ گیا۔

کمپاؤنڈر:۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب کہاں ہاتھ آنے کا۔

ڈرائیور:۔ ارے نہیں بابو جی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ پولیس کو تم نہیں جانتے وہ تو بیس پچیس برس پیچھے بھی ڈھونڈ نکالیگی۔

کمپاؤنڈر:۔ (زہر خند) اس سے کیا فرق پڑ جائیگا۔ یہی نا کہ زیادہ سے زیادہ تین چار برس کی سزا ہو جائے گی۔ اور سزا بھگت کر جب باہر نکلے گا تو باقاعدہ مجرم بن جائے گا۔ لیکن مرنے والا پھر بھی زندہ نہیں ہو سکے گا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز)

کمپاؤنڈر:۔ یہ ٹیلیفون بابو کدھر غائب ہو گیا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

(ٹیلیفون پر) سیٹھ کروڑی مل خیراتی ہسپتال۔ ادھو۔ تیسری منزل سے کود پڑے...... جی..... جی..... جی۔ جی اس غم میں بہتوں کے حواس بجا نہیں رہتے۔ کیا فرمایا؟ اچھا صرف ٹانگ کو چوٹ آئی ہے۔ چلئے شکر کیجئے سر تو بچ گیا ٹانگ تو لکڑی کی بھی لگ جائے گی۔ جی... جی، میں تو اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا یہ تو بڑے ڈاکٹر صاحب بتائیں گے۔ ویسے ہڈی عام طور سے جڑ جایا کرتی ہے بشرطیکہ بڑھاپا نہ ہو ـــ
کیا فرمایا پچاس سے اوپر ـــ پھر تو ـــ خیر میں ایمبولنس کار بھیج دیتا ہوں (چونکار رکھنے کی آواز)

ڈرائیور:۔ اب کیا ہوا؟

کمپافنڈر:۔ ارے بھائی ہونا کیا تھا۔ کوئی زعفران والے ہیں ہزاری مل ان کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ اور وہ تیسری منزل سے کود پڑے ہیں۔

ڈرائیور:۔ ہزاری مل کا دیوالہ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تو لاکھوں کی آسامی تھے۔ میں تو ان کی موٹر پر کام کر چکا ہوں ـــ ہزاری مل کا دیوالہ۔

کمپاؤنڈر:۔ ارے ہاں بھئی کروڑ پتی بننے کا چاؤ ہوگا۔ سٹے نے ڈوبا اور ساتھ ٹانگ بھی گئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (موسیقی)

راوی ۱:۔ ٹھیک ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔

راوی ۲:۔ اگر آتا ہے تو وہ چپ رہتا ہے۔

راوی ۱:۔ رات کی سیاہی کی طرح چپ۔ (وقفہ)

راوی ۲:۔ بے بسی کے اعلان کی طرح

راوی ۱:۔ اور یوں انسانوں کی دنیا ایک ابدی رات میں لپٹی ہوئی ہے صرف چند گھنٹوں کے لئے سورج اس کے سامنے آجاتا ہے۔ سایہ سورج کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی رات۔
..... بیتے وقت کا سایہ ....

(موسیقی اداس اور سنجیدہ آہستہ آہستہ ابھرے اور ڈوب جائے)۔

نئی کتابیں

دلیس سے باہر:- آغا محمد اشرف ایم۔ اے نے دنیا کی سیر و سیاحت کے بعد یہ علمی و ادبی مضامین لکھے ہیں۔ قیمت مجلد عہ؍

لندن سے آداب عرض:- آغا محمد اشرف ایم اے کے ان مضامین کا مجموعہ جو جنگِ عظیم کے دوران میں بی بی سی لندن سے نشر کیے گئے۔ مجلد عہ؍

ادبستان:- مولانا خلیقی دہلوی کے حسین اور دلکش ادبی مضامین کا بینظیر مجموعہ۔ آپ ایک بار ملاحظہ فرما کر بار بار مطالعہ فرمائیں گے۔ تیسرا کامیاب ایڈیشن قیمت مجلد عہ؍

صبح بہار، اخترستان، لالۂ طور:- ہندوستان کے نامور رومانی شاعر اختر شیرانی کے مجموعے کلام۔ ہر جلد خوبصورت گردپوش سے مزین ہے قیمت فی جلد تین روپے۔

تذکرہ حسینی:- مولانا علم الدین صاحب کراچوی نے علمائے اہلسنت و الجماعت کی مستند تصانیف و اعمال سے مناقب محرم پر سلیس اردو زبان میں قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ قیمت عہ؍

طیور آوارہ:- از اختر شیرانی۔ قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے۔

جدید اُردو شاعری:- پروفیسر عبد القادر کی مشہور کتاب۔ جس کو قابل مصنف نے ریوائز کر کے جدید شاعری کے موجودہ دور تک مکمل کر دیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

معاشیاتِ قومی:- ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے فریڈرش لسٹ کی جرمن کتاب سے براہِ راست ترجمہ کیا ہے قیمت مجلد آٹھ روپے۔

تاریخ انقلاب رُوس:- شیر جنگ کی انقلاب پسند طبیعت نے روس کے انقلابی پس منظر تاریخی و مجلسی ردوبدل کی تاریخ کو الفاظ کا خوشنما جامہ پہنایا ہے۔ اتنی دلچسپ کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ دم نہ لیں گے۔ قیمت مجلد چار روپے۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات:- شیر جنگ نے کارل مارکس کے حالاتِ زندگی، اُس کی تعلیمات اور اس سلسلہ میں عام جدوجہد کی تاریخ کو دلچسپ انداز میں کئی برس کی محنت سے تحریر کیا ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

اوراق پارینہ:- شیر جنگ کے ادبی مضامین کا مجموعہ، جن کا مطالعہ آپ کے ذہن کیلئے نئی راہیں کھول دیگا۔ قیمت عہ؍

رحمۃ للعالمین (کامل تین جلد) قاضی سلیمان منصور پوری کی مشہور عالم سیرۃ نبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ تین جلدوں میں مکمل مجلد ستر۱۷ہ روپے۔

مقالاتِ شیرانی:- حافظ محمود شیرانی کے تنقیدی مضامین جو علمی حلقوں میں نہایت بلند درجہ پا چکے ہیں۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

دھڑکتے دل:- اختر شیرانی کو آپ اُس کی شاعری سے بھی بلند جگہ دیں گے۔ جب اُس کے یہ افسانے آپ ملاحظہ فرمائیں گے قیمت تین روپے۔

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ:- چوٹی کے ڈراموں کا انتخاب از اختر شیرانی۔ آپ کا مذاقِ سلیم داد دیئے بغیر نہ رہے گا۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

ماڈرن اُردو ڈکشنری:- صاحبزادہ ابو نعیم عبد الحکیم نشتر جالندھری نے اُردو کے طالب علموں اور ضرورت مند اصحاب کیلئے ہر حرف کے ذیل میں تمام ضروری الفاظ درج کرنے کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی درج کر دی ہیں۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

سازِ فطرت، نیلوفر، صبر و ضبط، قسمت:- حسن عزیز جاوید کے بلند پایہ افسانوں کے چار مجموعے حسین گردپوش سے مزین۔ مجلد قیمت فی جلد عہ؍

شیشہ و سنگ، التفاتات:- خنجر لکھنوی بہت کہنہ مشق بلند پایہ ادیب ہیں اور دونوں کتابیں ان کے چوٹی کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہیں۔ قیمت عہ؍ ہم علمی و ادبی اور اسلامی کتابیں اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

کتاب منزل۔ کشمیری بازار۔ لاہور

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۷ء

رسالہ عالمگیر ۲۲ برس سے اردو علم و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دے رہا ہے اہلِ ذوق اُس سے ناواقف نہیں ہیں ہندوستان کا یہ ممتاز ترین ماہنامہ عام پرچوں کے علاوہ ہر سال تین وزنی اور ضخیم خاص اشاعتیں اپنے سالانہ خریداروں کو مفت پیش کرتا ہے یعنی اپریل میں افسانہ نمبر، جولائی میں سالانہ نمبر اور دسمبر میں خاص نمبر حالانکہ ان کی مجموعی قیمت چھ روپے اور ضخامت چھ سو صفحات سے کم نہیں ہوتی۔ اس گرانی و نایابی کے زمانہ میں بھی عالمگیر کے خاص نمبر اور سالانہ نمبر اُسی آن بان اور شان و شوکت سے شائع ہو رہے ہیں! اور مضامین کے لحاظ سے بھی وہ رفتارِ وقت اور ماحول کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے چنانچہ جنوری میں "خاص نمبر" پیش کیا جا رہا ہے جو ادبی و فنی خوبیوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہوگا ضخامت دو سو صفحات قیمت صرف دو روپے سالانہ چندہ چھ روپے چار آنے مع محصول ڈاک سالانہ خریداری کی رعایتوں سے مستفید ہونے کیلئے خاص نمبر سے اپنا سلسلۂ خریداری شروع کیجئے۔

خاص نمبر کے مضامینِ نظم و نثر کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے اس فہرست میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا ہے ——!

مینجر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور

"خاص نمبر" کی ایک جھلک

شعر و سخن

اے جانِ من	جوش ملیح آبادی
شاہِ خوباں آگیا	ڈاکٹر تاثیر
نغمہ و رقص	فراق گورکھپوری ایم اے
خواجہ فریدؒ	سید عطاء اللہ بخاری
بیوہ اور برسات	ثاقب کانپوری
دو آتشہ	ماہر القادری
نیا موڑ	اشعر ملیح آبادی
شاعرِ مشرق اور بندۂ محکوم	افسر احمد نگری
نغمۂ مسموج	راز یزدانی رامپوری

علم و ادب

دولتِ سکندری	مہر محمد خاں شہاب
حالی کی غزل گوئی	پروفیسر حامد حسن قادری
اسلوبِ بیان	محمد عظیم
سلامِ جلیل	احمد علی شاب

افسانے اور ڈرامے

حسنِ خوابیدہ	شبلی بی کام
شادی طے ہوگئی ہے	ستیش بترا ایم۔اے
کاش میں بھول سکتا	ظہور الحسن ڈار
اک تیرے جانے سے پہلے	طفیل ملک
پرندے	ایوب سرور
ٹیلی گرام	مقبول حسین احمد پوری
کرڈ دارس	رحمان مذنب
ناؤ	شاہین
جھلکیاں	زینت جہاں
چھایا پاتر	برق صہبائی

(نامکمل)

اردو میں اشتراکی لٹریچر

(باری صاحب کی نئی کتابیں)

کارل مارکس

"کمپنی کی حکومت" کا مصنف اس کتاب میں نئے دور کے بہت بڑے مفکر کارل مارکس کے معاشی، تاریخی اور فلسفیاتی نظریوں کو آسان اور عام فہم ہندوستانی میں پیش کرتا ہے۔ عمرانی علوم میں کارل مارکس نے نئے نظریے پیش کر کے ان علوم میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ کتاب ان انقلابی تصورات کو پیش کرتی ہے۔

ایک روپیہ چار آنے

مشین اور مزدور

کیا مشینوں کا وجود انسانوں کے لئے مفید ہے یا مضر؟ اس سوال کا جواب "مشین اور مزدور" میں دیکھیں۔ اس کتاب میں انگلستان، روس اور ہندوستان کی مزدور تحریک کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

ایک روپیہ چار آنے

سوشلزم

سوشلزم کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لئے کارل مارکس کے عمر بھر کے ساتھی فریڈرک اینگلز کی یہ کتاب بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب نے سوشلزم کو خیالی دنیا سے نکال کر سائنسی علوم کے دائرے میں داخل کر دیا۔

ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ اردو لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۵۳۱

لمحات رنگیں

زبیدہ سلطانہ کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے ہندوستانی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو انسانی نفسیات کے گہرے مطالع سے اجاگر کیا ہے۔ اس ترشے ہوئے ہیرے کی مانند جس کا ہر پہلو نظر افروز ہونے کے باوجود ایک الگ کیفیت کا حامل ہے۔ ان افسانوں میں دکھ، سکھ، رنج اور خوشی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والا پہروں ہی ان کے طلسم میں کھویا رہتا ہے۔ کتاب میں چند مزاحیہ افسانے بھی شامل ہیں جو زندگی کی بڑھتی ہوئی کشمکش اور اس کی بوجھل زنجیروں کو پرے پھینک اس میں سکون اور فرحت پیدا کرنے ضامن ہیں۔

قیمت ۲/-

ناظمہ کی آپ بیتی

ہر حقیقت افسانہ سے زیادہ دلکش اور رنگین ہے۔ ناظمہ کی آپ بیتی بھی ایک شریف زادی کی زندگی ہے۔ اتنی عبرتناک کہ پڑھنے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ حقیقت اتنی رومان پرور اور اتنی بیرحم ہے کہ افسانوی رنگ آمیزی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

ناظمہ کی آپ بیتی کوئی افسانہ یا ناول نہیں بلکہ ایک عورت کی داستان حیات ہے۔ آغاز سے انجام تک یکساں طور پر دلچسپ۔

ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کا لکھا ہوا 'دیباچہ'، خان بہادر عبدالرحمان چغتائی کا بنایا ہوا چھ رنگا سرورق اور ایم اسلم کا کتاب کا مصنف ہونا کتاب کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کی ضمانت ہے۔

قیمت - ۳/۴

پبلشرز:

پنجاب بکڈپو لاہور

مطبوعہ دین پریس، لاہور